جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا علمی، دینی، ادبی ترجمان

ماہنامہ

محدثِ عصر

بانی

فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ



مدیر

سید احمد خضر شاہ مسعودی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیادگار: محدثِ عصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا علمی، دینی، ادبی ترجمان

ماہنامہ

محدثِ عصر

دسمبر ۲۰۱۹ء جنوری ۲۰۲۰ء، جلد نمبر ۲۱، شمارہ نمبر ۱، سلسلہ نمبر ۱۸۵

بانی: فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ

مدیر: سید احمد خضر شاہ مسعودی

نائب مدیر

مولانا فضیل احمد ناصری

08881347125

نگراں ترسیل

مولانا ابوطلحہ اعظمی

09997504588

شائع کردہ

جامعۃ الامام محمد انور شاہ دیوبند

عقب عیدگاہ، دیوبند 247554 (یوپی)

فون آفس: 01336-220471 فون وفیکس (مدیر) 01336-222471-223371

موبائل (مدیر): 08006075484

ای میل: ahmadanzarshah@gmail.com

اشتراک وتعاون

اندرونِ ملک:

فی شمارہ -/15 سالانہ -/150

خصوصی -/1000

تاحیات -/10000

بیرونِ ملک:

سالانہ: 20 امریکی ڈالر

خصوصی: 100 امریکی ڈالر

تاحیات: 500 امریکی ڈالر

Composed By: Huda Computers Deoband 9456422412

ورق در ورق

عصریات

سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری

بالآخر بابری مسجد کا فیصلہ آہی گیا۔ انتظار ہی نہیں، بلکہ طویل ترین انتظار کے بعد۔ وہ مقدمہ جو 70 برسوں سے لاینحل بنا ہوا تھا، اور وہ قضیہ جس نے باشندگانِ وطن کے دو بڑے گروہوں میں سرد جنگ چھیڑ رکھی تھی آخر کار انجام کو پہونچا، لیکن فیصلہ عجیب ہوا۔ بڑا ہی عجیب۔ اس قدر تعجب انگیز کہ مسلمان تو مسلمان، بعض ہندو دانشور بھی ششدر رہ گئے، حتی کہ سپریم کورٹ کے سابق جج بھی سکتے میں۔ دلائل کل کے کل مسجد کے حق میں تھے۔ شواہد مسلمانوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ پوری تاریخ خانۂ خدا کو حق بجانب کہہ رہی تھی۔ ان سب کے باوجود وہی ہوا، جسے نہ ہونا تھا۔ گوگوئی جیسی شبیہ والے جج بھی معیاری فیصلے سے قاصر رہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

اس مقدمے کا سفر طویل بھی تھا، صبر آزما بھی۔ پیچ در پیچ بھی۔ اس دوران کتنی ہی سماعتیں ہوئیں، ہر بار ایسا لگا کہ مسئلہ فیصل ہو جائے گا اور پھر ہنوز روزِ اول۔ آخری بار سماعت چلی تو لگاتار چالیس روز تک چلتی رہی اور 16 اکتوبر کو یہ سماعت مکمل کر لی گئی۔ یاد ہوگا کہ اکتوبر 2010 میں الہ آباد ہائی کورٹ نے متنازعہ زمین کو نرموہی اکھاڑا، رام للا اور سنی وقف بورڈ کے درمیان برابر برابر تقسیم کا فیصلہ صادر کیا تھا۔ اندازہ یہی تھا کہ سپریم کورٹ اسی فیصلے کو برقرار رکھے گا، لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ فیصلہ الگ تھلگ آیا، بلکہ بالکل ہی جدا۔ فیصلہ یہ کہ نرموہی اکھاڑا کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ شیعہ وقف بورڈ کا دعویٰ بھی غلط۔ مسجد کی ساری زمینیں رام للا کو دی جائیں۔ حکومت تین ماہ کے اندر رام مندر کی تعمیر کا نقشہ پیش کرے۔ سنی وقف بورڈ کو اس کے بدلے میں پانچ ایکڑ زمین دے دی جائے۔

سپریم کورٹ نے فیصلہ سناتے ہوئے جن نکات پر زور دیا، وہ یہ تھے کہ بابری مسجد کسی مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ۱۹۴۹ء میں اس پر تالا لگنا بھی غلط تھا۔ ۱۹۹۲ء میں اس کا انہدام بھی نادرست تھا۔ فیصلہ کچھ اس ترتیب سے سنایا گیا کہ شروع شروع میں تو لوگوں نے یہی سمجھا کہ مقدمہ مسجد کے

حق میں جائے گا، لیکن آخر آتے آتے بات دوسری جانب مڑ گئی۔ یہ تاریخی فیصلہ 9 نومبر 2019 کو ہوا اور تاریخ نے آئندہ کے لیے اپنے وسیع دامن میں اسے محفوظ کرلیا کہ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ

اس فیصلے سے مسلم فریقوں نے عدمِ اطمینان کا اظہار تو کیا ہی ہے، سابق ججوں نے بھی حیرت کا اظہار کیا ہے۔ اشوک کمار گانگولی نے تو اس پر سخت حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ فیصلہ میری فہم سے بالاتر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہاں مندر نہیں، مسجد تھی۔ مسلمان کئی نسلوں سے اسے برابر دیکھتے آئے ہیں۔ ملک کا آئین بنا تو اس وقت بھی مسجد ہی تھی۔ پھر زمین مندر کو کیوں؟ سابق جج مارکنڈے کاٹجو نے بھی اس فیصلے پر تعجب کا اظہار کیا۔ سنی وقف بورڈ اگرچہ صاف کہہ چکا ہے کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ منظور ہے، تاہم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور دیگر مسلم فریقوں نے اس پر عدمِ اطمینان جتاتے ہوئے کہا کہ فیصلہ غلط ہے اور ہم اس کے خلاف نظرِ ثانی کی اپیل دائر کریں گے، چنانچہ اپیل دائر کردی گئی۔ خدشات تو یہی کہتے ہیں کہ اپیل دائر کرنا بے سود رہے گا، لیکن آئین نے اس کی اجازت دی ہے تو اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے!!! اور سطورِ ہذا قلمبند کرتے وقت وہ خدشات حقیقت بن کر سامنے آگئے کہ سپریم کورٹ نے یک قلم تمام دائر ریویو پٹیشن کو خارج کر دیا اور اب تو ؎

رونے والے رو چکے اور ہنسنے والے ہنس چکے
ایک پرانا واقعہ ہے خانہ ویرانی میری

۞۞۞

پارلیمنٹ میں وزیر داخلہ مسٹر امت شاہ نے سٹیزن امینڈمنٹ بل پیش کیا اور اکثریتی طاقت کے بل بوتے پر دونوں ایوانوں سے آنا فاناً منظور بھی کرالیا، بلکہ صدارتی مہر بھی اس پر ثبت ہوگئی، اگرچہ اپوزیشن جماعتوں نے اس کی جم کر دلائل کے ساتھ مخالفت بھی کی تو بعض جماعتوں نے روایتی منافقت اور بے شرمی کا مظاہرہ بھی کھلے عام کیا، مگر وزیر داخلہ کے تابڑ توڑ انداز کے سامنے سب لاچار نظر آئے۔

برسر اقتدار حکومت طلاق ثلاثہ بل، دفعہ 370، بابری مسجد مقدمہ، نیز اپنے دوسرے اقدامات کی بظاہر کامیابی سے، نیز اپوزیشن کی کمزوری، ناطاقتی، مصلحت کوشی جس کے ڈانڈے بزدلی سے مل جاتے ہیں اور منافقانہ روش سے یکے بعد دیگرے اپنے ایجنڈے کو لاگو کرنے والے سب ہی اقدامات اٹھا رہی ہے، اس کو شاید یہ غلط فہمی بھی ہے کہ فرقہ وارانہ منافرت کو عروج پر پہنچا کر وہ تمام ایجنڈا نافذ کرسکتی ہے۔ بھوک، بیروزگاری، مہنگائی، گراں بازاری جاں بلب معیشت، اور جبری زنا کاری جیسے مسائل سے بھی عوام کی توجہ ہٹانے اور ہندو راشٹر بنانے کے لئے یہ بہترین نسخہ ہے۔

چناں چہ اِسی فاتحانہ فضا میں بل منظور کرالیا گیا، اور پھر وہ ہوا جو حزبِ اقتدار نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا، پورا ہندوستان سراپا احتجاج بن گیا، جوان، بوڑھے،عورتیں،لڑکیاں، بچے، پڑھے لکھے،ان پڑھ،طلبہ واساتذہ سڑکوں پرنکل آئے، سیاہ بل کو واپس لینے کے لئے فلک شگاف نعرے بازی کی پرامن اور پرسکون مارچ کیے اور حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا کردیا،حکومت نے عوامی احتجاج کو دبانے اور خاموش کرنے کے لئے وسیع پیمانہ پرطاقت کا بےجا استعمال کیا،اوراب تک ۲۳؍قیمتی جانیں شہادت سے ہم کنار ہوگئیں،مگر ملک کے ہرحصہ میں ہرطبقہ میں اٹھنے والا یہ احتجاج تھم نے میں نہیں آرہا ہے، وزیراعظم صاحب نے رام لیلا میدان میں پھرایک بار غلط بیانی سے کام لیا اوراین آرسی سے قطعاً انکار کیا جبکہ صدر جمہوریہ ۲۰؍جون کی صدارتی خطاب میں اور وزیر داخلہ پارلیمنٹ کے ایوانوں میں دوٹوک لب ولہجہ میں NRC کے لانے کا اعلان فرماچکے۔

حکومت کو چاہئے جمہوری ملک کے شایانِ شان جمہوری عوام کے مطالبہ کو تسلیم کرے اور جس طرح ۷۰؍سالوں سے یہ ملک جمہوریت کی پٹری پررواں دواں ہے،اس میں رخنہ اندازی سے گریز کرے۔

۞۞۞

چشمِ فلک نے ڈرامائی سیاست کا ایک اور منظر دیکھا۔ مہاراشٹر کے اسمبلی انتخابات میں کسی بھی جماعت کو واضح اکثریت نہ مل سکی۔ 288 میں سے بھاجپا صرف 105 سیٹیں ہی لے سکی۔ شیوسینا کے حصے میں 56 نشستیں آئیں۔ این سی پی اور کانگریس کو بالترتیب 54 اور 44 سیٹیں ملیں۔ عام اندازہ یہی تھا کہ بھاجپا اپنے اتحادی شیوسینا کے ساتھ مل کر حکومت بنائے گی۔ دونوں طرف سے گرما گرم پہل بھی ہوئی۔ مگر شیوسینا نے یہ کہہ کر بھاجپا کی نیند اڑادی کہ حکومت دونوں پارٹیاں مساوی مدّت کی بنیاد پر چلائیں گی۔ ہر جماعت کی حکومت ڈھائی ڈھائی برس چلے گی۔ بھاجپا نے اس تجویز کا انکار کردیا۔ نتیجتاً دونوں جماعتوں کی 30 سالہ قدیم رفاقت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ واضح اکثریت سے محروم جماعتیں جب مایوسی کی شکار ہوئیں تو گورنر بھگت سنگھ کوشیارنے صدرراج کا اعلان کردیا۔ پھر وقت نے کروٹ لی۔ شیوسینا کے ساتھ این سی پی کی مشاورت ہوئی۔ طے پایا کہ شیوسینا کے صدرادھوٹھاکرے وزیرِ اعلیٰ ہوں گے۔ ابھی اس میٹنگ کو چند گھنٹے ہی گزرے تھے کہ اچانک بھاجپا اوراین سی پی کی حکومت سازی کی خبریں گردش کرنے لگیں۔ بھاجپائی رہ نما دیویندرفڑنویس وزیرِ اعلیٰ اوراین سی پی لیڈر راجیت پوار نائب وزیراعلیٰ بن چکے تھے۔ اس چونکا دینے والی سیاست نے دنیا کو بتادیا کہ یہاں اخلاقیات کے باب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن بات ابھی ختم کہاں ہوئی ہے! نئی حکومت کو اکثریت بھی تو ثابت کرنی تھی! جب وہ دن بھی آ گیا تو دونوں ہی ناکام ہو

گئے۔ یہ گٹھ جوڑ حکومت چند روز سے آگے نہ بڑھ سکا۔اس چند گھنٹے کی حکومت سے کسی کا فائدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اجیت پوار کا فائدہ تو بہر حال ہو ہی گیا۔ان کے نام پر جتنے مقدمات تھے،اتنے ہی گھنٹوں میں ختم کر دیے گئے۔یوں یہ چند ساعتی حکومت ان کے لیے واشنگ مشین ثابت ہوئی۔

حکومت کا ٹوٹنا کہ ادھوٹھا کرے پھر سرگرم ہو گئے اور کانگریس سے مل کر حکومت سازی کا دعویٰ کر دیا۔ انہیں اکثریت ثابت کرنی تھی،اس میں بھی پاس ہو گئے۔مہاراشٹر کی حکومت اب ٹھاکرے کے پاس ہے اور بھاجپا کے ہاتھ میں محض رسوائی۔ ہریانہ اور مہاراشٹر میں بھاجپا کا جو حشر ہوا ہے،اگر اس سے سبق نہ لیا گیا تو اس کے پنگھٹ کی ڈگر اور مشکل ہو جائے گی۔

۞۞۞

بی جے پی کی ہریانہ ومہاراشٹر کی رسوائی ونا کامی کی یہ داستانِ عبرت جھارکھنڈ پہنچی تو وہاں کے عوام نے بھی اس میں ایک اور الم ناک مرثیہ کا اضافہ کر دیا۔

بی جے پی کی مکمل اعلیٰ کمان نے جھارکھنڈ میں اپنے خیمے گاڑ دیئے تھے،میدانِ جنگ کا نقشہ بھی پانچ حصوں میں تقسیم کر کے تازہ دم دستے اور کمانڈروں کو اتارنے کی اسکیم تیار کی تھی،جس پر بڑی مستعدی اور چابک دستی سے عمل بھی کیا تھا، بڑے بڑے سپہ سالار اپنے ۵۵-۵۶ اور ۶۰/انچ کے سینوں پر طلاقِ ثلاثہ بل، دفعہ ۳۷۰ کے خاتمہ اور رام مندر کی تعمیر، این آر سی بل کے تمغے اور اسٹار سجا کر میدان میں اترے اور ان ہی لازوال حصولیابیوں کے عوض میں ووٹ مانگے گئے تھے، جھارکھنڈ کا نتیجہ فقط یہ خبر ہی نہیں کہ کانگریس اور جے ایم ایم نے بی جے پی کو عبرت خیز شکست دے دی بلکہ یہ منافرت،تشدد،فرقہ واریت اور ’’لڑاؤ اور حکومت کرو‘‘ کی سوچ کو دھتکارا گیا ہے،عوام کے مسائل کو نظر انداز کر کے صرف مغرور ومتکبر طرز کو اختیار کر کے پائیدار کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

۞۞۞

قند مکرّر **قسط**(۱۴)

ذٰلِكَ الْكِتٰب

فخر المحدثین حضرت مولانا سیّد انظر شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ

ہم نے ایک مفلوک الحال در در پھرنے والے بھکاری کو دیکھا اس کی حالتِ زار پر ہمیں تأسف ہوا، اپنے اس قلبی غم کو دور کرنے کے لیے ہم نے اس کو کچھ دے دیا۔ یہاں بھی دیکھ لیجیے کہ اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے سب کچھ کیا گیا۔ خدا تعالیٰ کے یہاں یہ بات نہیں، اور سنئے ہم کسی مجمعِ شرفاء میں بیٹھے ہوئے ہیں، جہاں کچھ امیر کبیر بھی ہیں، اور کچھ ہم سے چھوٹے بھی، وہاں اچانک آکر کسی نے ہم سے سوال کر دیا، اب ہم سوچتے ہیں کہ اگر اس وقت کوئی تعاون علی الخیر اس کے ساتھ نہ کیا گیا تو یہ مجمع میرے متعلق کیا کہے گا، کیا سوچے گا، نہ دینے کی صورت میں جو عار آنے والی ہے اس سے بچنے کے لیے ہم نے اسے کچھ دے دیا، خدا تعالیٰ کا معاملہ ایسا بھی نہیں۔

بیضاوی کے بعض نسخوں میں ربقة الحسة کا لفظ موجود ہے، اگر اس لفظ کی شرح مطلوب ہو تو وہ یہ ہے کہ مستحق حسنِ سلوک کے ساتھ بھی حسنِ سلوک نہ کیا جائے اور یہ نہایت ہی ناقص درجہ ہے کہ آدمی ایک حقیقی ضرورتمند کی ضرورت پوری کرنے سے بھی گریز کرے تو اب جو کچھ وہ دے رہا ہے نہ دینے کی صورت میں اس پر جو خست کا عیب لگتا اس سے بچنے کے لیے دے دیا۔ خدا تعالیٰ کے یہاں یہ بات بھی نہیں۔

اس تفصیل سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ خدا تعالیٰ ہی منعمِ حقیق ہے اور بندوں کی داد و دہش اسی کے انعامات کا فیضان ہے۔ لہٰذا منعمِ حقیقی اسی کو کہیں گے اور اس کے علاوہ کسی کو نہیں۔

۳- تیسرا حل یہ ہے کہ مفہوم رحمان میں کیفیت کے اعتبار سے زیادتی کا لحاظ کیا گیا تو لفظ رحمان اہم اور عظیم نعمت پر دلالت کرے گا۔ مواقع اوصاف میں اہم اوصاف کے تذکرے کے بعد خدا تعالیٰ کی چھوٹی چھوٹی نعمتوں کا ذکر باقی رہ گیا، ان کے بیان کے لیے لفظ رحیم کا اضافہ مناسب ہے۔ اس سے یہ بھی واضح

ہوگا کہ بندے خدا تعالیٰ سے صرف بڑی نعمتیں ہی طلب نہ کریں، بلکہ جن نعمتوں کو وہ چھوٹی سمجھ رہے ہیں ان کا سوال بھی خدا تعالیٰ ہی سے ہونا چاہیے، جو چیز کسی مضمون کو مکمل کرتی ہے اسے مکمِّل کہتے ہیں، مکمِّل طبعاً بعد میں آتا ہے اور چوں کہ یہاں تکمیل مضمون رحیم سے ہو رہا ہے اس لیے رحمان سے اسے مؤخر ہونا چاہیے تھا۔

۴- چوتھا جواب سننے سے پہلے ایک تمہیدی مضمون سن لیجیے، وہ یہ کہ شعر و شاعری میں بہت سی اصطلاحات ہیں۔ مثلاً شاعر جو اپنا مختصر نام شعر میں استعمال کرتا ہے اسے تخلص کہتے ہیں۔ پہلے شعر کو مطلع کہا جاتا ہے۔ اگر پوری غزل میں کوئی بہترین شعر ہو تو اس کے لیے بیت الغزل استعمال ہوتا ہے، شاعر نے اگر کسی کی تعریف میں کچھ اشعار کہے ہوں تو ان کا مجموعہ قصیدہ کہلاتا ہے۔ ابتدائی مضمون کے بعد جب وہ مقصد کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اسے گریز کہتے ہیں۔ علیٰ ہذا۔ شعر کا آخری حرف قافیہ اور اس سے پہلا ردیف کہلاتا ہے۔ شاعری میں قافیہ برابر چلتا ہے اور اس حرف کے ہم وزن حرف ہی دوسرے شعر میں استعمال کیا جاتا ہے، عرب جاہلیت کے مزاج پر شاعری غالب تھی، چناں چہ وہ نثر میں بھی شاعری کرتے ہیں، مقفّٰی و مسجّع کلام کرنے کے خوگر ہیں اور چوں کہ قرآن کریم عربوں کے ہی اسلوب پر نازل ہوا اس لیے قرآن میں بھی اس طرز کو ملحوظ رکھا گیا۔ اسے یوں سمجھیے کہ سورۂ کوثر ایک چھوٹی سی سورت ہے جس کی آیات یہ ہیں:

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝۱ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳

کوثر، وانحر، ابتر۔ نثر میں شعر کے انداز پر ملتے جلتے و ہم وزن حروف استعمال کیے گئے ہیں۔

یہ تمہید اگر آپ کے ذہن نشین ہوگئی تو اب چوتھے جواب کے سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ آیات کے آخری حروف کو بدستور باقی رکھنے کے لیے رحیم، رحمان سے مؤخر کیا گیا وہ اس طرح کہ:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵ الخ

اب رحیم بسم اللہ کا، رحیم سورۂ فاتحہ کا، مستقیم سورۂ فاتحہ کا، رؤس آیات کو ہم وزن لانے کی ایک شکل ہے۔ سو اگر رحیم مقدّم کر دیا جاتا اور رحمان مؤخر تو یہ انداز باقی نہ رہتا۔

تنبیہ

قاضی صاحبؒ شافعی المذہب ہیں، اور چاروں فقہاء کے مکاتیبِ فکر اور ان سے وابستہ اربابِ علم

قرآن وحدیث میں اپنے مسلک کی رعایت کرتے ہوئے چلتے ہیں۔قاضی صاحب کا یہ آخری جواب امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق ہے جو بسم اللہ کوسورۂ فاتحہ کا جزء مانتے ہیں، رؤس آیات کے تحفظ کا نقطۂ نظر انہیں کے مسلک کے مطابق ہوگا، امام ابوحنیفہ کے خیال کے مطابق نہیں ہے، چوں کہ وہ بسم اللہ کوسورۂ فاتحہ کا جزء نہیں مانتے ہیں۔

و الأظهر أنه غير مصروف و إن حظر اختصاصه بالله أن يكون له مؤنث على فعلٰى أو فعلانة إلحاقا له بما هو الغالب في بابه و إنما خص التسمية بهذه الأسماء ليعلم العارف أن المستحق لأن يستعان به في مجامع الأمور هو المعبود الحقيقي الذي هو مولى النعم كلها عاجلها و أجلها جليلها و حقيرها فيتوجه بشراشره إلى جناب القدس و يتمسك بحبل التوفيق و يشغل سره بذكره و الاستمداد به عن غيره.

ترجمہ: زیادہ واضح یہ ہے کہ رحمان غیرمنصرف ہے، حالاں کہ یہ خدا کے ساتھ خاص ہے اور یہ خصوصیت اس کا جواز باقی نہیں رہنے دیتی کہ اس کا مؤنث فعلیٰ یا فعلانۃ کے وزن پر آئے (چوں کہ خدا تعالیٰ کے لیے تانیث وتذکیر کچھ نہیں ہے) مگر اس کے باوجود اسے غیرمنصرف ہم اس لیے مانتے ہیں کہ رحمان ان ابواب کے ساتھ ایک خصوصی تعلق رکھتا ہے۔ جن میں غیرمنصرف ہونا شائع وذائع ہے اور تسمیہ میں خصوصی طور سے ان ہی اسماء کو ذکر کیا تا کہ یہ حقیقت نمایاں ہو کہ تمام معاملات میں صرف خدا سے مدد طلب کی جائے، چوں کہ معبودِ حقیقی صرف وہی ہے جملہ نعمتوں کا فیضان اسی کی جانب سے ہے۔نعمتیں عاجل ہوں یا آجل، بڑی ہوں یا چھوٹی، اگر عارف پر یہ نکتہ واضح ہوگیا تو وہ اپنی توجہاتِ کامل کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا، اسی سے توفیق کا طالب ہوگا، ظاہر و باطن دونوں کے اعتبار سے ذکر اللہ میں محو ہوگا۔

تشریح: چوں کہ قاضی صاحبؒ ہر فن سے متعلق بحث کرتے ہیں، اس لیے لفظ رحمان پر لغوی حیثیت سے بھی بحث فرمارہے ہیں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اس کی ایک تقسیم بحیثیت منصرف وغیرمنصرف بھی ہے، اور ان کے احکام بھی جدا ہیں۔آپ نے نحو کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ الف ونون زائدتان یہ کبھی اسم میں زائد ہوتے ہیں اور کبھی وصف میں۔اسم میں زیادتی کی صورت میں غیرمنصرف ہونے کے لیے علمیت ضروری ہے، وصف میں اضافے کی صورت میں، اسی وقت غیرمنصرف ہوسکے گا جب کہ بعض کے خیال میں اس کی مؤنث فعلانۃ کے وزن پر نہ آئے اور بعض کے خیال میں فعلیٰ کے وزن پر مؤنث ہونی چاہیے۔یہی وجہ ہے کہ سکران غیرمنصرف ان کے نقطۂ نظر کے مطابق ہے چوں کہ اس کی مؤنث فعلیٰ کے

وزن پر آتی ہے، اور ندمان کو منصرف پڑھا گیا کیوں کہ مؤنث ندمانۃ فعلانۃ کے وزن پر موجود ہے۔

اب رحمان کو لیجیے، اس کا مؤنث کا صیغہ فعلانۃ کے وزن پر نہیں آتا جو انتفاءِ فعلانۃ کے قائل ہیں ان کی رائے میں یہ غیر منصرف ہونا چاہیے۔ مگر جو وجود فعلیٰ کی شرط لگاتے ہیں۔ تو چوں کہ لفظ رحمان خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ اور اس کے لیے کوئی مؤنث نہیں، لہٰذا وہ اس رحمان کو منصرف کہیں گے۔ اس اختلاف کو قاضی صاحبؒ نے سمیٹتے ہوئے یہ فرمایا کہ بہتر یہی ہے کہ لفظ رحمان کو غیر منصرف پڑھا جائے، قاضی صاحبؒ کی دلیل یہ ہے کہ نظائر پر محمول کرنے کا رواج ہے۔ اور رحمان ان اوزان میں سے ہے کہ اس وزن پر آنے والے بیشتر الفاظ غیر منصرف ہوتے ہیں، اس لیے ہم بھی رحمان کو غیر منصرف پڑھنا بہتر سمجھتے ہیں۔
نحوی بحث سے فارغ ہوکر مفسر علام اس نکتے کو واضح کررہے ہیں کہ تسمیہ میں خدا تعالیٰ نے اپنے تمام اسماء میں سے رحمان اور رحیم کو ہی کیوں ذکر کیا، ان کی تقریر کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے لفظ سے جو بسم اللہ کے بالکل آغاز میں ہے معبودیت حقیقی خدا تعالیٰ کے لیے ثابت کی گئی تھی۔ یہ استحقاق کیسے ثابت ہو۔ اس کے لیے رحمان ورحیم استعمال کیا گیا۔ چوں کہ مخلوق اسی کو معبود سمجھتی ہے جس سے وہ ہر مہم میں امداد طلب کرے۔ اس کا تصوّر خالق کے بارے میں یہ ہے کہ تمام نعمتوں کا مصدر وسرچشمہ اس کی ذات ہو اور رحمان ورحیم اس کی دلیل ہے۔ نیز جب بندوں پر یہ راز کھل جائے گا کہ خدا ہی مستعان ہے اور وہی منعم حقیقی تو تمام مخلوق اپنی توجہات کے ساتھ ہر مرحلے میں طلب سوال کا ہو یا عبادت کا خدا ہی کو مرکزِ التفات بنائے گی اور اس طرح معرفت کے دروازے بندوں پر کھلتے چلے جائیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب

۞۞۞

اسلامی نظام تربیت
اوراس کے دوررس اثرات

مولانا سید محمد واضح رشید ندوی

انسان کے متعلق مغرب کا تصور

مغربی ماہرین تعلیم کی نظر میں انسان صرف جسم اور عقل کے مجموعہ کا نام ہے، اس وجہ سے مغربی نظام تعلیم میں انسان کی خواہشات پر زور دیا جاتا ہے اور انسان کو ایسے طریقے اور وسائل کی تعلیم دی جاتی ہے جن سے وہ اپنے دنیاوی مقاصد اور جنسی خواہشات کی تکمیل آزادی کے ساتھ انجام دے سکے،، انسان کے تئیں اس تصور پر مغرب کے تمام اصحاب فکر متفق ہیں، خواہ وہ نظریۂ ارتقا کے قائل ہوں، یا آزادیٔ فرد کے قائل ہوں، یا وہ اجتماعی مصلحت کے داعی ہوں، ان سب کے نزدیک انسان اپنی خواہشات کی تکمیل میں حیوان کی طرح بالکل آزاد ہے، اس اعتبار سے دونوں میں عقل وشعور کے سوا کوئی فرق نہیں ہے۔

اس مغربی نظریہ تعلیم کی بنیاد پر ماہرین تعلیم وتربیت کی تمام تر توجہات حصول معاش اور معیار زندگی کو بلند اور مستحکم کرنے کے لیے مواقع اور وسائل کی فراہمی پر مرکوز ہوگئیں، تاکہ انسان عیش وآرام کے وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھا سکے، نفسانی خواہشات کی تکمیل کر سکے، عیاشی اور لذت کوشی کی زندگی گزار سکے، عزت وجاہ اور غلبہ واقتدار تک پہنچ جائے اور عقل کا کام یہ طے کیا گیا کہ وہ صرف جسم کے مطالبات کو پورا کرنے اور وسائل کی فراہمی میں مدد کرے۔

مغربی نظام تعلیم وتربیت

لہٰذا نظام تعلیم وتربیت بنانے والوں کے پیش نظر صرف یہ رہا کہ انسان کے جسمانی تقاضوں اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کیسے ہوگی؟ اوراس کے کیا کیا طریقے ہوسکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں ان کی مثال اس تاجر

کی ہے جو صرف گاہک کی خواہشات اور ڈیمانڈ پر توجہ کرتا ہے، اس کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ اس کی خواہشات کیسی ہیں، اس غلط نظریہ تعلیم کا، جس میں انفرادی یا اجتماعی استحصال کا مزاج غالب ہے، موجودہ زندگی پر بہت برا اثر پڑا اور تعلیم حیوانی فطرت اور جنسی خواہشات کو فروغ دینے کا ذریعہ بن گئی، اس لیے کہ مادی نظام حیات، جو اس وقت پوری دنیا پر حاوی ہے، انسان کے لیے اپنے مقرر کردہ تقاضوں: غذا، کپڑا اور جنسی آسودگی ہی کے اردگرد گھومتا ہے، رہے دوسرے امور تو وہ یا تو ثانوی درجہ کے ہیں یا اس وقت تک قابل قبول سمجھے جاتے ہیں جب تک کہ مادیت کے مقرر کردہ مذکورہ بالا تقاضوں سے متصادم نہ ہوں۔

انسان کے متعلق اسلام کا تصور

انسان کے متعلق اسلام کا نظریہ مغربی اور مادی نظریہ سے بالکل جدا ہے، مغربی علوم اور مادی نقطۂ نظر سے انسان حیوانی فطرت کا ترقی پذیر امتداد ہے، جو عقل و شعور سے ممتاز ہے، جب کہ اسلام کی نظر میں انسان اشرف المخلوقات اور روئے زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے، مسجودِ ملائکہ ہے، اسلام مسیحیت کی طرح انسان کے جائز فطری تقاضوں اور خواہشات پر نہ پابندی لگاتا ہے اور نہ ہی انسان کو بالکل آزاد چھوڑتا ہے، جیسا کہ مادہ پرست یورپ کا نظریہ ہے کہ انسان بالکل آزاد ہے، وہ کسی قانون اور اخلاق کا پابند نہیں ہے۔

اس اعتبار سے اسلام انسان کی ایسی تربیت کرتا ہے، جس میں اس کے جسمانی، عقلی اور روحانی تقاضوں کا بیک وقت حسین تناسب کے ساتھ خیال رکھا جاتا ہے، اس کے عقل شعور اور اخلاق کی ایسی تشکیل اور تربیت کی جاتی ہے کہ جس سے وہ روئے زمین پر اللہ کی نیابت کا کردار بحسن وخوبی ادا کر سکے: ﴿وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۠﴾ (سورۃ الاسراء:70) (اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا اور نفیس نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوق پر فوقیت دی)۔

اسلام انسان کو حیات بخش سرگرمیوں کی اجازت دیتا ہے، اسے غور وفکر، تدبر اور وسائل زینت اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، حقِ آزادی سے بھرپور صحیح فائدہ اٹھانے پر ابھارتا ہے اور انسان کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ اپنی جسمانی و عقلی صلاحیتوں اور روحانی طاقتوں کو انسان کی خدمت، اس کی عزت و شرافت کی حفاظت جیسے اعلی اور بلند مقاصد میں استعمال کرے، نہ کہ محدود بشری تقاضوں میں، جن میں انسان اور جانور دونوں برابر ہیں، لہٰذا کھانا پینا، پہننا اوڑھنا اور نفسانی خواہشات کی تکمیل یہ تو انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے، کل مقصدِ حیات نہیں۔

مادّی ذہنیت اور اسلامی ذہنیت کا فرق

مادی ذہنیت اور اسلامی تربیت سے تشکیل پانے والی ذہنیت کا موازنہ ہم حضرت ربعی بن عامر کے اس جملہ سے کر سکتے ہیں، جو انہوں نے رستم کے سامنے کہا تھا کہ "اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس لیے برپا کیا ہے کہ ہم بندوں کو بتوں کی پرستش سے نکال کر خدائے واحد کی عبادت کی طرف لائیں، بندوں کو دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت کی طرف لائیں۔"

ربعی بن عامر نے اس زمانہ میں جب کہ معاشرہ اپنی بلندی کو پہنچ چکا تھا، غذا، کپڑے اور نفس کی آسودگی کو دنیا کی تنگی اور ایک قسم کی غلامی شمار کیا۔

اسلام کا متوازن نظام ترتیب

اسلام آزادی کا مذہب ہے، اس میں عقیدہ کی بھی آزادی ہے اور زندگی کی بھی، اس طور سے کہ زندگی کی آزادی انسان کی عام عزت وشرافت سے متصادم نہیں ہوتی جس سے اللہ تعالیٰ نے اسے نوازا ہے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ انسان کی صحیح تربیت کی جائے فکر انسانی کی صحیح خطوط پر تشکیل کی جائے اور انسان کے اندر اپنے مقام ومرتبہ اور شرافت وکرامت کا شعور اور اپنے خالق ومالک رب العالمین کے سامنے جواب دہ ہونے کا احساس جاگزیں کیا جائے۔

اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی نظام تربیت میں اول دن سے عقیدہ کی درستگی پر بنیادی اور ترجیحی طور پر زور دیا جاتا ہے، اس تربیت کا آغاز بچے کی ولادت کے وقت ہی سے ہوجاتا ہے کہ دنیا میں آتے ہی سب سے پہلے اس کے کانوں میں کلمۂ توحید کی آواز پہنچتی ہے کہ اللہ ایک ہے، اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں اور وہی خالق وپالنہار ہے، اس کے بعد ماں کی گود میں بچہ کی تربیت ہوتی ہے اور اسلام پوری راہ نمائی کرتا ہے، اس کے بعد گھر کے باہر کا ماحول شروع ہوتا ہے اور اسلام اس مرحلہ میں بھی پوری راہ نمائی کرتا ہے اور کچھ پابندیاں اور بندشیں لگائی جاتی ہیں اس طور پر کہ اس کی فطری سرگرمیوں اور طبعی میلانات کو مقید نہیں کیا جاتا اور اسلام اس مرحلہ میں بچہ کو ہر قسم کے شیطانی وسوسہ اور شر سے بچاتا ہے اور اس کے میلانات اور فطری تقاضوں میں تناسب اور توازن پیدا کرتا ہے، تاکہ فطری میلانات اس کی روحانی صلاحیتوں پر حاوی نہ ہوں: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰ (اور قسم ہے انسان کی جان کی اور اس کی جس نے اس کو درست بنایا، پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری دونوں باتوں کو اس کو القاء کیا، یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس جان کو پاک کرلیا

اوروہ نامراد ہوا جس نے اس کو فجور میں دبا دیا)۔

ارشاد ربانی ہے:﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝۴ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝۵ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۶ ﴾ (سورہ التین) (ہم نے انسان کو بہت خوب صورت سانچے میں ڈھالا ہے، پھر ہم اسے پستیوں سے بھی زیادہ پست کر دیتے ہیں البتہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کیے تو ان کے لیے اجر غیر منقطع ہے)۔

شعور کی تربیت

اسلام میں تعلیم کا آغاز انسان کے شعور کی تربیت سے ہوتا ہے، اسے بتایا جاتا ہے کہ اس کا خالق حقیقی کون ہے اور اپنے خالق و رب کے سامنے جواب دہ ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے اور اسے ان خطرات اور چیلنجز سے آگاہ کیا جاتا ہے جو بشری تقاضوں اور نفسانی خواہشات اور اس میں عدم توازن کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝۵ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤى ۝۶ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝۷ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝۸ (سورہ علق) (آپ پڑھیے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے سب کو پیدا کیا جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ہے آپ (قرآن) پڑھا کیجیے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی ہے جس نے انسانوں کو ان چیزوں کی تعلیم دی جنہیں وہ نہیں جانتے تھے، ہاں ہاں بے شک انسان حد سے نکل جاتا ہے اس بنا پر کہ اپنے کو مستغنی سمجھتا ہے، (اے مخاطب) تیرے رب ہی کی طرف سب کو لوٹنا ہوگا)۔

عقیدہ کی تربیت

اسلامی نظام تربیت میں عقیدہ تربیت کی بنیاد ہے اور اسی پر انسان کی دنیوی اور اخروی کامیابی کا انحصار ہے، عقیدہ ہی انسان کا اصل محافظ اور نگراں ہے، عقیدہ بیدار آنکھوں کی طرح ہے، عقیدہ ہی انبیاء ورسل کی تربیت کی اساس ہے اور انبیاء تعلیم و تربیت میں ہمارے نمونہ اور آئیڈیل ہیں، اسلام نے عقیدہ کو تنہا نہیں چھوڑا ہے، بلکہ اسے عمل صالح اور ایک دوسرے کو حق وصبر کی تلقین سے مربوط کیا ہے، یعنی زندگی میں بلند انسانی قدروں، پاکیزہ زندگی اور انسان کی عزت وشرافت کی حفاظت کے لیے مصائب اور پریشانیوں کو برداشت کرنے کی تلقین کرتا ہے، اس طرح اسلام نے فرد اور جماعت کی شرافت وعظمت کو تحفظ فراہم کیا ہے۔

مثالی انسان

لہٰذا اسلامی تربیت کی رو سے مثالی انسان وہ نہیں جو صرف کسبِ معاش اور خواہشاتِ نفس کی تکمیل کی تگ ودو میں لگا رہے، بلکہ اسلام کی نظر میں نیک انسان وہ مومن صالح ہے جو اپنے خالق کا حق شناس ہو، اپنی زندگی کو اپنے خالق و مالک کی مرضی ومنشا کے مطابق گزارے، اللہ کے بندوں کے درمیان ایک فرد صالح اور انسانی برادری میں ایک شریف رکن کی حیثیت سے رہے، پوری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہے، نہ کہ صرف اپنے مفاد کے لیے وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (سورہ حشر:۹)(دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، اگر چہ وہ خود ہی اس کے ضرورت مند ہوں)۔

درحقیقت اسلام کی نظر میں بہترین مثالی انسان وہ ہے جو دوسروں کی خاطر اپنے نفس کو قربان کر دے، اس طرح مادی تربیت اور اسلامی تربیت میں بڑا نمایاں فرق ہے، مادی تربیت خود غرضی اور مفاد پرستی کو بڑھاوا دیتی ہے، جب کہ اسلامی تربیت انسان کو اپنائیت قربت، خلوص ومحبت، ایثار وقربانی اور ہم دردی وغم گساری کے زیور سے آراستہ کرتی ہے۔

اسلامی تربیت کی جامعیت اور خصوصیات

اسلامی تربیت ہر چیز کو اس کے مناسب مقام پر رکھتی ہے کہ انسانی سرگرمی کا کوئی پہلو مغلوب نہ ہونے پائے اور جسم، عقل اور روح کے درمیان توازن برقرار رہے، انسان کو دوسرے کے لیے آئیڈیل بناتی ہے، اور کائنات میں اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہونے کی ترغیب دلاتی ہے، اس اعتبار سے اسلامی تربیت انسان کے جسمانی، عقلی، شعوری، ذوقی اور روحانی تمام پہلوؤں کو محیط ہے اور اسلامی تربیت انسان کو متوجہ کرتی ہے کہ اس کی تمام سرگرمیاں ایک اعلیٰ مقصد پر مرکوز ہوں اور وہ دنیا وآخرت میں اللہ کی خوشنودی اور رضا کے حصول کا ذریعہ ہو۔

اسلام ایسے فرد اور سماج کی تشکیل کرتا ہے جس میں صرف خدائے وحدہ لاشریک کی پرستش ہو اور پھر اس کے ذریعے سے اس میں اجتماعی زندگی کی خوبیاں: باہمی تعاون، یکجہتی، رواداری، ہم دردی، اخوت وبھائی چارہ اور الفت ومحبت کی جلوہ گری ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان کی ذاتی صلاحیتیں اور شخصی خصوصیات مجروح نہ ہوں۔

تربیت اسلامی انسان کو فضائل ومحاسن کی تلقین کرتی ہے اور تمام انسانوں کو فلاح انسانی کی دعوت دیتی ہے: (اے مومنو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے، ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں

عورتوں سے تمسخر کریں، ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں اور اپنے مومن بھائی کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو، ایمان لانے کے بعد برا نام رکھنا گناہ ہے، اور جو توبہ نہ کریں، وہ ظالم ہیں، اے مومنو! بہت گمان کرنے سے احتراز کرو، کہ بعض گمان گناہ ہیں اور ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے، کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے (تو غیبت نہ کرو) اور خدا کا خوف رکھو، بے شک خدا توبہ کرنے والا مہربان ہے، لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے، تا کہ ایک دوسرے کی شناخت کرو اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے، بے شک خدا سب کچھ جاننے والا ہے اور سب سے خبردار ہے۔) (سورہ حجرات: 11-13)

اسلامی تربیت چیزوں کے درمیان توازن، تناسب، عدل اور توافق و مساوات قائم کرنے کا نام ہے۔ اور یہ فطرت انسانی کے باہمی فرق کی رعایت اور احترام کرتی ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (سور بقرہ: 194) (تو جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے)۔ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾ (سورہ آل عمران: 186) (اور اگر تم صبر کرو اور تقوی اختیار کرو تو یہ تاکیدی احکام میں سے ہے)۔

اسلامی تربیت کے نتائج و ثمرات قرآن و سنت کی طرف رجوع کر کے ہی حاصل ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ یہی دونوں اسلام کے اعلیٰ مقصد کے حصول کا سرچشمہ اور منبع ہیں اور یہ اعلیٰ مقصد اطاعت الٰہی اور اتباع سنت رسول ہے اور انسان کی تمام جسمانی، روحانی، عقلی صلاحیتوں کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنا اور پھر ہر عمل میں رضائے الٰہی مطلوب ہو۔

قرآن کریم نے تربیت کو تعلیم سے مربوط کیا ہے: هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲﴾ (سورہ جمعہ ۲) (وہی تو ہے جس نے امی لوگوں میں انہی میں سے ایک پیمبر بھیجا، جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے درآنحالیکہ یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے)۔

قرآن کریم نے لفظ "حکمت" کو اخلاق، آداب اور گفتگو میں نرمی اور بردباری کے لیے استعمال کیا ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ (سورہ نحل: 125) (آپ اپنے رب کی راہ کی طرف بلایئے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے اور ان کے ساتھ

بحث کیجیے پسندیدہ طریقہ سے)۔قرآن نے پوری زندگی میں حکمت اختیار کرنے ،احسان کرنے اور انسان کے اکرام واحترام، جدو جہد اور عمل کی دعوت دی ہے۔

قرآن مجید کا نظام تربیت

کمانا اور جنسی خواہشات کو پورا کرنا انسانی فطرت کا تقاضہ ہے،لہٰذا انسان کی طبیعت بغیر کسی ترغیب و تلقین کے ان کی طرف مائل ہوتی ہے،قرآن کریم نے اس سلسلہ میں بھی سب سے الگ اور منفرد انداز اختیار کیا ہے،لہٰذا قرآن کریم نے حلال کمائی کی جگہیں اور طریقے اس طور پر متعین کیے ہیں کہ کسب معاش ذکر اللہ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے، کیوں کہ انسان کی تخلیق کا اصل مقصد عبادت اللہ ہی ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورہ ذاریات:56)(اور میں نے تو جن وانس کو پیدا ہی اس غرض سے کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔) قرآن ان لوگوں کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے جنہوں نے عبادت اور تجارت کو تناسب کے ساتھ جمع کر لیا تھا: رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (سورہ نور:۳۷)(ایسے لوگ جنہیں نہ تو تجارت غفلت میں ڈالتی ہے، نہ خرید وفروخت اللہ کی یاد سے) فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (سورہ جمعہ:10)(پھر جب نماز پوری ہو چکے تو زمین پر چلو اور اللہ کی روزی تلاش کرو اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو، تاکہ تم فلاح پاؤ)۔

قرآن نے کسب سے زیادہ انفاق پر زور دیا ہے،اس لیے کسب تو انسان کی فطرت میں داخل ہے،لہٰذا قرآن نے جگہ جگہ پر خرچ کرنے کے مواقع بیان کیے ہیں اور افراد اور معاشروں کو مال کی محبت، استحصال اور خود غرضی سے پاک کرنے پر ابھارا ہے،اس لیے کہ یہی ہر بیماری کی جڑ ہے اور مال کی محبت سماج کے بگاڑ اور طبقاتی استحصال کا بنیادی سبب ہے۔

قرآن نے جس طرح انفاق پر زور دیا ہے اسی طرح جنسی خواہشات میں اسراف سے ڈرایا بھی ہے، لہٰذا قرآن نے بار بار جنسی خواہشات میں اسراف اور انتہا پسندی کے خطرات سے آگاہ کیا ہے،حدود بیان کیے ہیں اور ان اسباب کو بیان کیا،جن سے انسان اس وبا کا شکار ہوتا ہے۔

قرآنی نظام تربیت کا اعلامیہ

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں قرآنی نظام تربیت کا چارٹر یہ ہے:

1......خدائے واحد کی عبادت کی جائے۔

2......والدین کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور ان کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔

3...... ہر وقت یہ خیال رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے۔اس عقیدہ و ذاتی تصور سے تنہائی اور پردۂ خفا میں بھی شر کے منافذ بند ہو جاتے ہیں اور اسلام نے یہ تصور دے کر ایک ایسا نگراں مقرر کر دیا ہے جو کھلے چھپے ہر حال میں انسان کی نگرانی کرتا ہے۔

4......قرابت داروں ،مسکینوں اور غریبوں و ناداروں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے ،اس طرح اسلام نے استحصال کے تمام راستے بند کر دیے۔

5......زندگی میں میانہ روی اختیار کی جائے ،فضول خرچی نہ کی جائے ،بخل سے کام نہ لیا جائے ،کسب معاش کے دوران یہ خیال رہے کہ یہ اللہ کا دیا ہوا رزق ہے ،اس لیے اس کو صحیح طریقوں سے حاصل کیا جائے اور جائز جگہوں پر خرچ کیا جائے۔

6......اسلامی قدروں کا حامل سماج تشکیل دینے کے لیے اولاد کی صحیح تربیت کی جائے۔

7......خواہشات کی تکمیل میں انتہا پسندی سے بچا جائے ،تاکہ سماج میں اخلاقی اور سماجی بے راہ روی اور انارکی پیدا نہ ہو۔

8......قتل ناحق سے گریز کیا جائے ،تاکہ اجتماعی امن وامان قائم رہے،انسان کی زندگی محفوظ رہے اور ایک ایسا سماج وجود میں آئے جو با مقصد اور پر امن ہو۔

9......یتیم کے مال میں تصرف میں حتی الامکان احتیاط برتی جائے۔

10......عہد و پیمان کو پورا کیا جائے۔

11......ناپ تول پورا پورا کیا جائے۔

12......دوسروں کی ٹوہ میں نہ پڑا جائے اور افواہیں نہ پھیلائی جائیں۔

13......تکبر،گھمنڈ اور غرور سے بچا جائے۔

اسلامی نظام تربیت کے اس عالمی اور انسانی اعلامیہ کی ہمسری متمدن دنیا کا کوئی بھی نظام تعلیم و تربیت نہیں کرسکتا ،اسلامی نظام تربیت سب سے پہلے انسان کی فکر وعقیدہ ،اس کے سلوک اور اس کے جذبات کی اصلاح کرتا ہے، پھر اس کی صلاحیتوں کی آب یاری کرتا ہے،انفرادی اور اجتماعی زندگی میں انسان کی بھر پور راہ نمائی کرتا ہے اور انسان کو ذاتی مفاد کے تنگ دائرہ سے نکال کر اعلیٰ مقصد کے راستہ پر گامزن کرتا ہے اور زندگی کے اعلیٰ ترین تصور حیات سے روشناس کراتا ہے۔

غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلامی نظام تربیت ہی انسانی معاشرے میں پائے جانے

والے کرپشن اور بگاڑ کا واحد علاج ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ میری بعثت مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ کے اخلاق قرآن کا پرتو ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾ (سورہ احزاب:21)

(رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لیے، یعنی ایسے شخص کے لیے جو اللہ سے اور روز آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو۔) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ (سورہ آل عمران:31)

(آپ یہ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سب سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے اور بڑی عنایت فرمانے والے ہیں)۔

❁❁❁

حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر فرمایا:

آج ہمارا حال مختلف ہے، اللہ والوں کی مجلس سے ہم بھاگتے ہیں، ہم جس ماحول میں رہتے ہیں وہ گناہ وعصیان کا ماحول ہے، گردوپیش سے عام انسان تو عام انسان ہے، ولی بھی متاثر ہوجاتا ہے، سنیما اور گانوں کی آواز، دنیا کی فحاشی یہ سب کچھ انسان کو متاثر کرتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا عاد وثمود کی بستی سے جب گزر ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ چھپالیا اور صحابہ کو جلدی سے گزر جانے کے لیے فرمایا، دیکھیے ماحول کا اثر، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں کس قدر اہمیت کا حامل ہے، اگر اثر کا خوف نہ ہوتا تو جلدی سے کیوں گزرتے؟ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ برے ماحول سے کٹ کر اللہ والوں کی مجلس میں بیٹھو، نورانیت پیدا ہوگی اور اچھے اثرات پڑیں گے۔

(باتیں ان کی یاد رہیں گی، صفحہ 53، از مولانا محمد رضوان القاسمیؒ)

اِسلامی تعزیرات کی معاشرتی اہمیت

مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب

معاشرہ کا سماجی ڈھانچہ پانچ چیزوں پر اُستوار ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک میں خلل آجائے تو اس سے معاشرہ کی بنیادیں متزلزل ہوجاتی ہیں، اس کا امن وسکون غارت ہوجاتا ہے اور معاشرے کا ہر فرد کرب اور بے چینی کا شکار ہوجاتا ہے۔ وہ پانچ چیزیں یہ ہیں: عقیدے کا تحفظ، نسب کا تحفظ، عزت وآبرو کا تحفظ، جان کا تحفظ اور املاک کا تحفظ۔

چناں چہ ہر عقل مند انسان جس کی ذہنیت غلط تربیت یا فاسد ماحول کی بنا پر مسخ نہ ہوگئی ہو وہ اپنے دین، اپنے نسب، اپنی جان، اپنی عقل اور اپنے املاک کو عزیز رکھتا ہے اور اُن کے تحفظ کا خواہاں ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کا دین اور عقیدہ محفوظ رہے، اس کی عزت وآبرو اور جان و مال پر کوئی آنچ نہ آئے، اس کا نسب ہر غلط آمیزش سے پاکیزہ ہو، اس کی عقل ہر قسم کے فتور سے محفوظ رہے اور وہ ہر اعتبار سے امن وسکون اور راحت کی زندگی بسر کرے اور اللہ کی ذات کے سوا اسے کسی کا خوف نہ ہو، وہ چاہتا ہے کہ جس معاشرے میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے وہ امن وسلامتی کا گہوارہ ہو۔ اس میں خیر اور عدل وانصاف کے چرچے ہوں۔ اس میں دینی اور اخلاقی اقدار کی قدر وقیمت کو ٹھیک طور سے محسوس کیا جاتا ہو اور اس سے شر وفساد کے آثار کا خاتمہ ہوجائے وہ اپنے معاشرے کو ایک پُرامن، باوقار اور ترقی یافتہ مثالی معاشرہ دیکھنا چاہتا ہے۔ جو قوتِ حاکمہ معاشرے کو کنٹرول کر رہی ہو، یہ فرض اُس پر عائد ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کے ہر فرد کو ان پانچ بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دے اور ان سماج دُشمن عناصر کی گوشمالی کرے جو معاشرے کی بنیادوں کو منہدم کرکے پورے معاشرے کو تہ وبالا کردینا چاہتے ہیں۔ اسلامی حدود وقصاص اور شرعی تعزیرات کی مشروعیت کا ایک اہم مقصد یہی ہے۔

اِسلام نے اِنسان کو ساری مخلوق سے بلند مقام بخشا ہے اور اسے دوسری مخلوق پر عزت وفوقیت عطا کی ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ ''(اسراء:۷۰)

ترجمہ:''اور ہم نے عزت دی آدم کی اولاد کو۔''

اور اس کے عقیدہ، نسب، عقل، جان اور مال کے تحفظ کی ضمانت دی ہے۔دین اور عقیدہ کی حفاظت کے لیے جہاد کو شروع کیا۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَ لَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ ﴿۱۹۰﴾''(البقرۃ:۱۹۰)

ترجمہ:''اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی مت کرو بے شک اللہ ناپسند کرتا ہے زیادتی کرنے والوں کو۔''

نسب اور عرض کی حفاظت کے لیے نکاح کو مشروع کیا اور زنا اور تہمت لگانے کو حرام قرار دیا اور ان جرائم کے ارتکاب کرنے والے کے لیے حدود جاری فرمائیں۔اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

''اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ ۪ وَّ لَا تَاۡخُذۡکُمۡ بِہِمَا رَاۡفَۃٌ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۚ وَ لۡیَشۡہَدۡ عَذَابَہُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲﴾(النور:۲)

ترجمہ:''بدکاری کرنے والی عورت اور مرد۔مارو ہر ایک کو دونوں میں سے سو سو دُرّے اور نہ آوے تم کو اُن پر ترس اللہ کے حکم چلانے میں اگر تم یقین رکھتے ہو۔اللہ پر اور پچھلے دن پر۔اور دیکھیں ان کی سزا کچھ لوگ مسلمان۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''وَ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَاۡتُوۡا بِاَرۡبَعَۃِ شُہَدَآءَ فَاجۡلِدُوۡہُمۡ ثَمٰنِیۡنَ جَلۡدَۃً وَّ لَا تَقۡبَلُوۡا لَہُمۡ شَہَادَۃً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۙ﴿۴﴾''(النور:۴)

ترجمہ:''اور جو لوگ عیب لگاتے ہیں پاک دامنوں کو پھر نہ لائے، چار شہادتوں کو، تو مارو ان کو اَسی (۸۰) دُرّے اور نہ مانو ان کی کوئی گواہی کبھی اور وہی لوگ ہیں نافرمان۔''

اسلام عقل کی بھی حفاظت کرتا ہے اس لیے اس نے شراب اور دیگر منشیات کو حرام قرار دیا اور اس کے پینے پر حد مقرر کی ہے وہ ہر فرد کی جان کی بھی حفاظت کرتا ہے اس لیے قتل کو جرم قرار دیا اور اس کے لیے قصاص کو مشروع کیا۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

’’يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ‘‘(البقرۃ:۱۷۸)

ترجمہ:’’اے ایمان والو! فرض ہوا تم پر قصاص مقتولوں میں۔‘‘

اور فرمایا:

’’وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝‘‘(البقرۃ:۱۷۹)

ترجمہ:’’اور تمہارے واسطے قصاص میں زندگی ہے اے عقل مندو!۔‘‘

وہ مال کی بھی حفاظت کرتا ہے، اس لیے اس نے حلال کمانے پر زور دیا ہے اور اس نے تجارت اور دیگر حلال وسائل کو مشروع کیا ہے اور ناحق دوسرے کا مال کھانے کو حرام ٹھہرایا اور چوری کی سزا مقرر کی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

’’وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝‘‘ (المائدۃ:۳۸)

ترجمہ:’’اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت کاٹ ڈالو ان کے ہاتھ، سزا میں ان کی کمائی کی، تنبیہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ غالب ہے حکمت والا۔‘‘

اسلام کے اقدامات سے ثابت ہوا کہ وہ ان کلیاتِ خمسہ (دین، نسب، عقل، جان، مال) کے تحفظ کو کتنی اہمیت دیتا ہے اور ان کی حفاظت کے لیے اسلامی معاشرہ کے ہر فرد کی کیسی صحیح اور حقیقی تربیت کرتا ہے۔ وہ اُن کے ضمیر کو زندہ کرتا ہے، ان کی معنوی روح کو بلند کرتا ہے۔ ان میں روحانی و اخلاقی اقدار کی عظمت پیدا کرتا ہے۔ ان میں اُلفت و محبت، اِیثار و قربانی اور باہمی اکرام و احترام کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ یہ تربیت اِسلامی تعلیمات اور صالحین کی مجالست سے حاصل ہوتی ہے اور اس تربیت کے بعد اسلامی معاشرے کا ہر فرد اپنے معاشرے کا ایک مفید رکن بن جاتا ہے۔ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی پسند کرتا ہے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور جس چیز کو اپنے لیے ناپسند کرتا ہے وہ دوسرے کے لیے بھی ناپسند کرتا ہے۔ اور جیسے اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کو ضروری سمجھتا ہے اسی طرح دوسرے کی جان، عزت اور مال کی بھی حفاظت کرتا ہے اور اس پر دست درازی کو ایسا ہی بُرا سمجھتا ہے جیسے اپنے اوپر دست درازی کو بُرا سمجھتا ہے۔ اس کے نفس میں ایک ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے جو اسے خیر پر آمادہ کرتی ہے اور شر اور دوسرے پر دست درازی سے روکتی ہے۔ حقیقت میں یہ وہ مثالی معاشرہ ہے جس میں امن و امان ہو اور عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ ہماری اسلامی تاریخ کا ابتدائی دور ان مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہم پر ایسا دور بھی گزرا ہے جب قاضی صاحب مہینوں عدالت لگائے بیٹھے رہتے تھے اور ایک مقدمہ بھی ان کے یہاں

پیش نہیں ہوتا تھا،عورت تنہا سفر کرتی تھی اور اسے اللہ کی ذات کے سوا کسی کا خوف نہ ہوتا تھا،کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے۔ یہ راحت وسکون، یہ امن اور چین، یہ عدل وانصاف جانتے ہو کس چیز کا نتیجہ تھا؟ اسلامی تعزیرات کا، اسلامی تعلیم وتربیت کا اور اسلامی اقدار کا۔ ہر معاشرے میں کچھ مریض نفوس بھی ہوتے ہیں جن پر تربیت ونصیحت کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ وہ صرف سختی کی زبان جانتے ہیں اور انہیں جرائم سے صرف حدود اور عقوبات ہی روک سکتی ہیں۔ معاشرے میں ایسے افراد کی مثال جسم کے ان مریض اعضاء کی سی ہے جن کے علاج کے لیے ٹیکے لگانے اور آپریشن کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جب کہ اس کے ٹھیک ہونے کی اُمید ہو اور بیماری اپنے ابتدائی مرحلہ میں ہو،لیکن اگر کوئی عضو گل سڑ جائے تو اسے کاٹ کر جسم سے الگ کیے بغیر چارہ نہیں رہتا تا کہ اس کا زہر دوسرے اعضاء تک سرایت کرکے پورے جسم کی ہلاکت کا سبب نہ بنے۔اسلامی حدود اور تعزیرات کا مقصد بس انہی معاشرتی مریضوں کا علاج ہے تا کہ وہ صحت یاب ہو کر معاشرے کے صحت مند افراد بن سکیں اور ایک صاف ستھرا اسلامی معاشرہ قائم رہے۔

کسی فرد کے عقیدہ، اس کی عزت، اس کی جان، اس کی عقل اور اس کے مال پر کسی قسم کی دست درازی اسلام کی نظر میں بہت بڑا جرم ہے جس سے معاشرتی نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔اس لیے اس پر سخت اقدامات تجویز کیے گئے۔ تا کہ مجرم کو اِرتکابِ جرم سے باز رکھا جائے اور معاشرے سے فساد کا مادہ ختم کردیا جائے۔ اِسلامی معاشرہ میں جب کسی شخص کو اس کا نفس اور شیطان کسی جرم کے اِرتکاب پر آمادہ کرے گا تو وہ اِرتکابِ جرم سے پہلے بار بار پاداشِ عمل کو سوچنے پر مجبور ہوگا اور ہوش میں آکر اس غلط ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہے گا۔

اَعداءِ اِسلام جنہیں اللہ تعالیٰ نے نورِ اِیمان سے ہی نہیں بلکہ معاشرتی امن کی حقیقی بنیادوں کو سمجھنے سے بھی محروم رکھا ہے۔ وہ ان شرعی حدود پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور انہیں **نَعُوْذُ بِاللّٰه** ''وحشیانہ سزاؤں'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالاں کہ بعض دفعہ وہ خود اپنے ملکوں میں معمولی جرائم پر اس سے بھی سخت سزائیں جاری کرتے ہیں۔حقیقت میں یہ سب باتیں اسلام سے کینہ وعداوت اور بغض وعناد کی بِنا پر کہی جاتی ہیں۔ان دانش مندوں سے کوئی پوچھے کہ کیا ان سنگین جرائم کا اِرتکاب ''وحشی پن'' نہیں؟ اور جس معاشرے میں چند اِنسان نما بھیڑیئے گھناؤنے جرائم کا اِرتکاب کرکے ''وحشی'' بن جائیں اور اَربابِ اِقتدار معاشرے کو ان ''وحشیوں'' سے نجات دلانے کے لیے کوئی ٹھوس اقدام نہ کریں۔کیا چند دنوں میں وہ پورا معاشرہ ''وحشی'' نہیں بن جائے گا؟ کوئی عقل مند انسان ان گھناؤنے جرائم کی سنگینی اور وحشی پن سے اِنکار نہیں کرسکتا جس کا اِرتکاب یہ مجرم کرتا ہے اور جس کا دِفاع یہ اَعداءِ اِسلام کررہے ہیں۔

ذرا سوچیے کیا بلاوجہ کسی بے گناہ کی جان تلف کردینا ''وحشی پن'' نہیں؟ جسے ایک مجرم معمولی اسباب کی بنا پر قتل کرکے اس کی بیوی کو بیوہ اور اس کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو یتیم بنا دیتا ہے اور انہیں اپنے والد کے سایۂ عاطفت سے محروم کردیتا ہے؟

کیا یہ وحشیانہ حرکت نہیں کہ ایک مجرم پل بھر میں ایک مزدور یا ملازم کی مہینوں اور سالوں کی خون پسینے کی کمائی اُڑا لے جاتا ہے اور اسے اور اس کے اہل وعیال کو ضروریاتِ زندگی تک سے محروم کردیتا ہے؟

ایک شہر یا ایک محلہ کے باشندے نہایت امن وامان کی زندگی بسر کررہے ہیں، انہیں اپنی عزت، جان اور مال کا کوئی خطرہ نہیں، یکا یک ایک مجرم آکر ان سب کی زندگی مکدر کردیتا ہے، اور ان کے امن اور سلامتی کو خوف اور پریشانی سے بدل دیتا ہے کیا یہ وحشی پن نہیں ہے؟ اور پھر جو شخص ایسے مجرم کی پشت پناہی کرتا ہے اور اس سے تعاون کرتا ہے یا اس پر رحم کھاتا ہے جسے بے گناہ مخلوق کمزوروں اور یتیموں اور بیواؤں پر ترس نہیں آتا کیا یہ شخص اس مجرم کی مانند ان وحشی جرائم کا اِرتکاب نہیں کررہا؟

''فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴿٤٦﴾'' (الحج: ۴۶)

ترجمہ: ''بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں، بلکہ سینوں کے اندر دل اندھے ہیں۔''

نیز یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اَعداءِ اِسلام کے یہ اعتراضات کوئی نئی چیز نہیں جو ان کے اذہان کی اختراع ہو بلکہ قدیم زمانے سے ائمہ ضلال اس قسم کی باتیں کہتے رہے ہیں اور ہمیشہ اہل حق نے واضح اور مسکت جواب دے کر ان کو خاموش کیا ہے۔ چناں چہ ان ہی ائمہ ضلال میں سے ایک نے سرقہ کی سزا قطع ید کے بارے میں اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا:

يد بخمس مئين عسجد وديت مابالها قطعت فی ربع دينار؟

''وہ ہاتھ جس کی دیت پانچ سو دینار ادا کی گئی۔ کیا وجہ ہے کہ اسے ربع دینار کے بدلے کاٹ دیا گیا۔''

اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی کا ہاتھ غلطی سے کسی نے کاٹ دیا تو اس کی دیت پانچ سو دینار ادا کی جاتی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ یہی ہاتھ اگر چوتھائی دینار چوری کرے تو اس کے بدلے میں کاٹ دیا جاتا ہے۔ ایک عالم نے اس کا جواب یوں دیا:

عزّ الامانة اغلاها وارخصها ذلّ الخيانة فافهم حكمة البارى

''امانت کے اعزاز نے اسے قیمتی بنا دیا تھا اور خیانت کی ذلت نے اسے بے قیمت بنا دیا۔ اللہ کی حکمت کو سمجھ لو۔''

جس کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ ہاتھ امانت دار تھا کسی کے مال میں تعدی نہیں کرتا تھا تو یہ قیمتی تھا اور جب اس نے دوسرے کے مال پر تعدی کر کے خیانت کی تو بے قیمت اور ذلیل ہو گیا۔

ان اَعداءِ اِسلام کی بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ شرعی حدود پر اعتراض کرتے ہوئے انہیں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر قیاس کرتے ہیں۔ایسے انسان جو نورِ ایمان سے محروم ہیں، جو صرف مادی عقل سے سوچتے ہیں اور جنہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کل کے حالات کیسے ہوں گے، وہ اپنے موجودہ ماحول کے حالات کو دیکھ کر ان ہی کی روشنی میں قوانین وضع کرتے ہیں، اس لیے کل جب حالات بدل جاتے ہیں تو مجبوراً انہیں وہ قوانین بدلنے پڑتے ہیں۔اَعداءِ اِسلام اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ شرعی حدود انسان کی وضع کردہ حدود نہیں بلکہ وہ آسمانی حدود ہیں، جن کو ایک ایسی ذات نے اُتارا ہے جو خالق بشر ہے اور جو انسان کی خصلت وجبلت اور اس کی طبیعت ومزاج سے واقف ہے جو قیامت تک کے آنے والے حالات سے واقف ہے، جو یہ جانتا ہے کہ فلاں جرم کتنا سنگین ہے، اس کی ٹھیک ٹھیک سزا جو عدل کی ترازو میں تول کر دی جائے کتنی ہونی چاہیے اور جسے یہ خبر ہے کہ فلاں جُرم کا اِرتکاب معاشرے پر کیا تباہی لاسکتا ہے اور اس کی روک تھام کیسے ہوسکتی ہے، اس نے جب یہ حدود اُتاری ہیں تو انہیں انسان کی اصلاح کے لیے اتارا ہے اور اس نے انسانی معاشرے کو امن اور چین مہیا کرنے کے لیے یہ تریاق نازل کیا ہے۔

حاصل یہ کہ حق تعالیٰ نے حدود وقصاص کے جو قوانین عطا کیے ہیں وہ انسانی ذہن کی اپج نہیں، جو آئے دن انسانی معاشرے پر قانونِ سزا نافذ کرنے کی مشق کرتے رہتے ہیں اور عطائی کی طرح جب ایک نسخہ فٹ نہیں آتا تو دوسرا بدل دیتے ہیں۔نہیں! بلکہ یہ خدائی قوانین ہیں، جنہیں اس کے علم محیط اور حکمت کاملہ نے جرائم کی ٹھیک ٹھیک تشخیص کرنے کے بعد تجویز فرمایا ہے اور انہی کے نفاذ میں باعزت اور پُرامن زندگی کی ضمانت ہے لیکن جو عقول کہ حق کو سمجھنے سے قاصر ہیں یا جو مادیت اور شہوات میں گرفتار ہو کر فاسد ہوچکی ہیں وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتیں، لہٰذا انہیں اسلام کے بجائے اپنے آپ کو ملامت کرنا چاہیے اگر چمگادڑ سورج کو نہیں دیکھ سکتی تو سورج کا اس میں کیا قصور ہے۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک شبہ کا ازالہ کیا جائے جو اَعداءِ اِسلام عامة المسلمین میں پھیلا کر حدود کے بارے میں غلط تاثر پیدا کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔وہ تاثر یہ دیا جارہا ہے کہ اگر شرعی حدود جاری ہوں تو ہر طرف ہاتھ کٹے نظر آئیں گے۔جگہ جگہ سنگساری ہورہی ہوگی۔کوڑوں کے لیے ٹکٹکی بندھی ہوئی ہوگی۔گویا یہ لوگ پہلے سے فرض کر لیتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ کی اکثریت ایسی ہے، (حالاں کہ یہ بات مغربی معاشرہ کے بارے میں کہنا صحیح ہوگی۔) اور اَعداءِ اِسلام نے اپنے معاشروں کو

دیکھ کر اِسلامی معاشرہ کو بھی اسی پر قیاس کرلیا ہو مگر ہم کہتے ہیں کہ یہ اسلامی معاشرے کے بارے میں صرف بدگمانی نہیں بلکہ تہمت ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی نے پھل توڑ لیا یا لکڑی کاٹ دی یا کوئی اور معمولی چیز چُرالی تو فوراً ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ اس کے بارے میں اتنا سمجھ لیا جائے کہ اسلام نے جہاں جرائم پر حدود جاری کرنے کا حکم دیا وہاں اس کے ساتھ ساتھ قیود اور شرائط بھی لگائے ہیں۔ جب تک وہ سب شروط نہ پائی جائیں گی، اُس وقت تک شرعی حد جاری نہیں ہوتی۔ اور اگر تمام شروط موجود ہوں ایک شرط کی کمی ہو تب بھی حد ساقط ہوجاتی ہے۔ اگر اس میں کسی قسم کا معقول شبہ پیدا ہوجائے تب بھی حد ساقط ہوجاتی ہے۔ مثال کے طور پر چوری کی سزا کو لے لیجیے، اس کے ثبوت کے لیے کچھ شرائط ایسی ہیں جن کا تعلق مسروقہ مال سے ہے اور مسروقہ مال کی بھی ایک قیمت مقرر ہے اس سے کم نہ ہو۔ ان تمام شرائط کے پائے جانے اور شرعی شہادت کے بعد حد جاری ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ شریعت نے اس کی بھی اجازت دی ہے کہ صاحب حق اگر چاہے تو سارق کا معاملہ عدالت تک پہنچنے سے پہلے اسے معاف بھی کرسکتا ہے۔ اس کی تفصیل اسلامی قانون (فقہ) میں موجود ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر کسی شرط کی کمی یا شبہ کی بناء پر حد ساقط ہوجائے تو مجرم بالکل چھوٹ جائے گا یا وہ اس کو بہانہ بنا کر دوبارہ اس جرم کا اِرتکاب کرنے لگے۔ ایسی صورت میں عدالت پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس مجرم کو مناسب سزا دے تاکہ جرائم کا انسداد ہو اور معاشرہ ہر قسم کے فساد سے پاک ہوجائے۔

۞۞۞

الفاظ کا جادو

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

اگر آپ کا تعلق اونچے طبقے سے ہے تو کسی ''سرا'' میں ٹھہرنا آپ کے لیے باعثِ توہین، لیکن کسی ''ہوٹل'' میں قیام کرنا ذرا بھی باعث شرم نہیں، حالاں کہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے کہ ''سرا'' مشرقی ہے، ہندستانی ہے، دیسی ہے، اور ''ہوٹل'' مغربی ہے، انگریزی ہے، ولائتی ہے۔ کوئی اگر یہ کہہ دے کہ ''سرا'' کے فلاں ''بھٹیارے'' سے آپ کا یارانہ ہے تو آپ اس کا منھ نوچ لینے کو تیار ہوجائیں لیکن فلاں ہوٹل کے ''منیجر'' سے آپ کا بڑا ربط وضبط ہے، اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں، حالاں کہ سرا کے ''بھٹیارے'' اور ہوٹل کے ''منیجر'' کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولائتی ہونے کے اور کوئی فرق ہے؟ کسی مدرسے میں اگر آپ ''مدرّس'' ہیں تو بات کچھ معمولی ہی ہے، لیکن کسی ''کالج'' میں آپ ''لکچرار'' یا ''پروفیسر'' ہیں تو معزز ہیں، صاحب وجاہت ہیں، حالاں کہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے ''مدرّس'' اور ''پروفیسر'' ایک ہی چیز ہیں۔

ندوہ کے ''دارالاقامہ'' میں اگر آپ قیام پذیر ہیں تو آپ کا دل کچھ خوش نہیں ہوتا، لیکن اسی ''دارالاقامہ'' کا نام جب آپ ''شبلی ہوسٹل'' سنتے ہیں تو آپ کا چہرہ فخر وخوشی سے دمکنے لگتا ہے۔ ''مدرسہ'' میں اگر آپ پڑھتے یا پڑھاتے ہیں تو خود اپنی نظروں میں آپ بے وقعت ہیں، لیکن اگر آپ کا تعلق کسی ''کالج'' سے ہے تو پھر آپ سے زیادہ معزز کون ہے؟ اب ہر مدرسہ طبیہ، طبیہ اسکول، اور مدرسہ تکمیل الطب اور ''مدرسہ'' منبع الطب، اب تکمیل الطب کالج اور ''منبع الطب'' کالج ہیں، مدرسہ وہاجیہ طبیہ کا زمانہ گیا، اب اس کا صحیح نام طبیہ وہابیہ ''کالج'' ہے، طبی درسگاہوں کو چھوڑیئے، خود دینی درسگاہوں کا کیا حال ہے؟ وہ دن گئے جب زبانوں پر ''مدرسہ'' چشمۂ رحمت کا تذکرہ تھا، اب وہ چشمۂ رحمت ''کالج'' ہے اور وہاں کے صدر مدرّس ''پرنسپل'' صاحب ہیں، مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل کے سب سے بڑے استاذ کو

''صدر مدرّس'' ذرا کہہ کے تو دیکھئے آپ کی غلطی کی تصحیح کی جائے گی کہ ان کا عہدہ اب صدر مدرّسی کا نہیں ''پرنسپلی'' کا ہے۔

کوئی آپ سے کہے کہ یہ کیا آپ گلی میں کھڑے ہوکر ''گلی ڈنڈا'' کا تماشہ دیکھ رہے ہیں تو آپ شرما سے جائیں گے، لیکن جب آپ ''کرکٹ'' یا ''فٹ بال'' یا ''ہاکی'' کا میچ کھلے میدان میں دیکھ رہے ہوں گے تو اس وقت نہ آپ اپنے بڑوں سے شرمائیں گے، نہ چھوٹوں سے، بلکہ عجب نہیں کہ گراں قدر ٹکٹ خریدنے کے بعد دوسروں کی طرف اکڑ کر دیکھیں۔ مینڈھے لڑاتے ہوئے، یا بٹیر بازی یا مرغ بازی کرتے ہوئے اگر آپ کہیں پکڑ لیے گئے تو اپنے کو کسی کے سامنے منھ دکھانے کے قابل نہ سمجھیں گے، لیکن جب شہر میں باکسنگ کا مقابلہ ہوگا یا کوئی Heavy Weight Champion آ جائیں گے تو ان کا تماشہ دیکھنا تہذیب اور روشن خیالی میں داخل، کہیں چوری چھپے ''رہس'' یا ''نوٹنکی'' دیکھنے کھڑے ہو جایئے تو خود آپ کی ثقافت اور وضعداری آپ پر لاحول پڑھنے لگے، لیکن تھیٹر میں آدھی آدھی رات بے تکلف بسر کیجیے کہ ''ڈراما'' جیسے فن شریف کی شرافت وعظمت میں کس کو کلام ہوسکتا ہے؟ اپنے دیس کے کسی بھانڈ، کسی سازندہ، کسی ڈھاڑی سے، اگر آپ سے شناسائی ہوگئی ہے تو اس کا ذکر آپ اپنے دوستوں اور بے تکلف ہم عصروں کے سامنے بھی کچھ جھینپ ہی کر کرتے ہیں، لیکن ''چارلی چیپلن'' اور ''میری پکفرڈ'' کے کمالات اور ''آرٹ'' کی جتنی داد جی چاہیے دیجیے، بھری محفلوں میں، بزرگوں اور استاذوں کے مجمع میں اور اخبارات کے صفحات میں آپ کی نقادی ہی کی داد ملتی جائے گی! ''نٹوں'' کا پیشہ بھی بھلا کوئی عزت کا پیشہ ہے، اور خدانخواستہ آپ سے کسی نٹ یا نٹنی سے ملاقات کیوں ہونے لگی، لیکن وہی قلابازیاں کھانے والے جب سرکس والے اور سرکس والیاں بن کر آپ کے سامنے آتے ہیں، تو نہ آپ اُن سے ملنے میں شرماتے ہیں، نہ تعلقات بڑھانے میں۔

جوئے یا جواریوں سے ظاہر ہے ہماری شرافت کو کیا تعلق ہوسکتا ہے، کوئی ہمیں جواری کہہ دیکھے، اپنی جان اور اس کی جان ایک کر دیں، لیکن گھوڑ دوڑ کے دنوں میں اور کارنیوال کی راتوں میں، دن دہاڑے اور بجلی کی روشنی میں یہی ذلت ہمارے لیے عین عزت بن جاتی ہے، اور بڑے بڑے رئیس اور معززنہ جوئے کی بازی لگاتے ہوئے شرماتے ہیں اور نہ اپنے کو ریس باز کہلاتے، نخاس میں کسی ''کباڑیئے'' کی دکان پر مول تول کرنا ہماری عزت وشرافت کے لیے باعث ننگ، لیکن مال روڈ پر ''پیک ایلن'' کی کوٹھی میں گشت لگانے میں نہ کوئی عار ہے نہ کوئی شرم، اس لیے کہ ''پیک ایلن'' صاحب کوئی کباڑیئے تھوڑا ہی ہیں ''آکشنر'' اور ''نیلامیے'' ہیں۔ چوک اور امین آباد میں کسی ''حلوائی'' کی دوکان سے پوری مٹھائی اپنے ہاتھ سے

خریدیئے تو نظریں بچا بچا کر، لیکن حضرت گنج میں ''ویلیر یو'' کی دکان کے سامنے اپنا موٹر کھڑا کر کے کیک و پیسٹری کی خریداری بہ نفس نفیس، بلا جھجک فرمائیے، اس لیے کہ ''ویلیر یو'' حلوائی نہیں، ''کنفکشنر'' ہے، نظیر آباد کے کسی چوراہے پر کسی شربت والے کی دوکان سے ''فالودہ'' کا گلاس خریدنا آپ کی خودداری کے منافی، لیکن حضرت گنج میں صاحب کی جگمگاتی دوکان پر ''آئس کریم'' نوش فرمانا آپ کی عزت اور شان کے عین مطابق، کسی نانبائی کی دوکان کا نام اگر ''ریسٹران'' پڑ جائے تو وہی عار فخر میں تبدیل ہو جائے۔ ''نائی'' بیچارہ جب تک محض نائی ہے یا حجام، اس کے استرے اور کسوت کے آگے سر جھکانا آپ کیوں کر گوارا فرما سکتے ہیں، لیکن وہی جب اپنے کو ہیئر ڈریسر Hair Dresser کہلانے لگے اور اپنی چوراہے کی دوکان پر ''ہیئر کٹنگ سیلون'' کا سائن بورڈ لگا دے تو وہی ناگوار آپ کے لیے خوشگوار اور پسندیدہ بن جائے، عدالت کا پیادہ جب تک ''چپراسی'' یا ''مذکوری'' ہے حقیر و ذلیل ہے، لیکن وہی پیادہ اگر ''بیلف'' کہہ کر پکارا جائے تو معزز ہے اور آپ کی زبان پر محض بیلف نہیں، بلکہ ''بیلف صاحب'' آنے لگے، کوئی چمار یا موچی اس قابل کب ہوتا ہے کہ آپ اسے منھ لگائیں، لیکن وہی رذیل اگر کسی ٹینری کا مالک کہلانے لگے تو معاً اس کی رذالت آپ کی نگاہ میں عزت و شرافت سے بدل جاتی ہے، اور دنیا کے سب سے بڑے موچی باٹا کی قوم سے تعلق رکھنا تو عین دلیلِ اعزاز، بستی کا ساہوکار یا مہاجن بڑے سے بڑا ہو، آپ کی نظر میں محض ''بنیا'' ہے لیکن وہی بنیا اگر وہیں کسی بینک کا منیجر ہو جائے یا اپنے کو بینکر کہلانے لگے تو دیکھئے اس کا مرتبہ دم بھر میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے، کسی رئیس کا ''مصاحب'' آپ کی نظر میں اخلاقی حیثیت سے بے عملی، خوشامد، چاپلوسی اور خود فروشی کا مجسمہ ہے، لیکن صاحب کے ''پرائیویٹ سکریٹری'' اور ''اے ڈی سی'' کا نام ادھر آیا اور ادھر معاً آپ کی نظروں میں کارکردگی و مستعدی، رعب و دبدبہ کی تصویر پھر گئی، پنچایت کا نام آیا اور آپ کے ذہن نے نیچ قوموں کا تصور شروع کر دیا، لیکن اِدھر پنچایت کے بجائے پارلیمنٹ اور اسمبلی، کونسل اور کارپوریشن کے الفاظ بولے گئے اور آپ کا ذہن ان فرنگی پنچایتوں کی بلندیوں پر رشک کرنے لگا، کوئی مولوی غریب اگر عالمگیری اور شامی کے جزئیات فقہی کا حافظ ہے تو غبی ہے، کودن ہے، کندہ ناتراش ہے، محض ملا ٹا ہے، لیکن اگر کسی ایڈوکیٹ یا بیرسٹر صاحب کو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے نظائر از بر ہیں تو ان کی قابلیت خوش دماغی اور ذہانت کے اعتراف میں سب سے آگے آپ ہی ہیں۔

فسانہ عجائب اور طلسم ہوشربا کے نام آج مجال ہے کہ کوئی زبان پر لا سکے لیکن لندن اور برلن، پیرس اور نیویارک سے کتنے ہی نئے عجائب افسانے اور کتنے ہی ہوشربا طلسمات رومانی ناولوں کے نام سے جاسوسی افسانوں کے نام سے ''سنسنی خیز'' خبروں کے نام سے صاعقہ اثر ڈراموں کے نام سے اور خدا معلوم کن کن

ناموں سے ہر سال اور ہر ہفتہ، اور ہر روز اور ہر صبح اور ہر شام شائع ہوا کریں، ان سے باخبر رہنا اور پوری دلچسپی وانہماک کے ساتھ ان کی نشر واشاعت میں، ان کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہنا علم وروشن خیالی کی دلیل اور مہذب وتعلیم یافتہ ہونے کی سند! کوئی آپ کو صلاح دے کہ ''لوہاری'' کا پیشہ اختیار کیجیے، تو آپ اسے گالی سے کچھ ہی کم سمجھیں گے لیکن ''میکینکل انجینئر ی'' کے عہدے کی طرف آپ خود لپک لپک کر بڑھ رہے ہیں، ''جراح'' کے لفظ سے جو تخیل آپ کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ کس درجہ پست ہے، لیکن ''سرجن'' کا نام لینے سے اس پستی میں کتنی بلندی آجاتی ہے، محلہ اور پڑوس کے ''جلاہے'' آپ کے خیال میں پست وادنیٰ، لیکن کپڑا بننے والے اگر لنکا شائر کے ہیں، تو کیا ان کی بابت بھی آپ کا یہی خیال ہے؟ ''بزاز'' گز ہاتھ میں لیے اور مزدور کے سر پر گٹھری اٹھائے شہر میں پھیری کرتے پھرتے ہیں، ان کی کوئی عزت ووقعت نگاہ میں نہیں، لیکن وہی کپڑا بیچنے والے اگر مانچسٹر کے باشندے ہیں تو بس معزز ہیں، بلند ہیں۔ ''بزرگوں'' کے سالانہ فاتحے منانا دلیلِ حمق وعلامتِ وہم پرستی، لیکن فلاں کالج کے احاطے میں ''فاؤنڈرس ڈے'' یا ''یومِ تاسیس'' دھوم دھام سے منانا دلیلِ دانش وبرہانِ روشن خیالی، لکھنؤ کے چوک یا دہلی کی چاوڑی کی پیشہ ور کا نام آپ بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ ہرگز اپنے کسی بزرگ کے سامنے نہ لیں گے، نہ کسی کا ناچ مجرا دیکھنے کھلم کھلا تشریف لے جائیں گے، لیکن ڈرائنگ روم میں گھر کے سب مردوں اور عورتوں، لڑکوں اور لڑکیوں کے سامنے ریڈیو سے، بے تکلف آپ فلاں بائی جی اور فلاں ''جان'' کے نغموں، ٹھمریوں سے لطف اٹھائیں گے اور فلم ایکٹرس جو بھی آپ کے دل میں جگہ کرلے گی، پوری بے باکی سے آپ اس کے چرچے ہر چھوٹے بڑے کے سامنے کریں گے۔

کوئی کہاں تک گنائے اور ناموں اور لفظوں کی کتنی لمبی فہرست تیار کرے، نمونہ کے لیے یہ کافی بلکہ کافی سے کچھ زائد ہی ہیں، اپنی واقفیت کی دنیا میں خود نظر دوڑائیے اور دیکھ لیجیے کہ زندگی کے ہر شعبے میں، معاشرت ومعاملت کی ہر گوشہ میں فرنگیت کے راستے سے ''صاحب'' کے رشتے سے، آپ کے کانوں تک پہنچے ہیں، ان میں ان کے دیسی مترادفات سے کتنی زیادہ عظمت، کتنی زیادہ اہمیت، کتنی زیادہ بلندی ہمارے دلوں اور دماغوں نے غیر محسوس طور پر قبول کرلی ہے، اگلوں نے بہت کیا تو یہی کیا تھا کہ ملک فتح کرلیے، قلعے سر کرڈالے، فوجوں کو میدانِ جنگ میں شکست دے دی، اس سے زیادہ نہ چنگیز سے کچھ بن پڑا، نہ ہلاکو سے، نہ دارا سے نہ سکندر سے، یہ شرف مخصوص اسی دور یا جوجی کے لیے اٹھ رہا تھا کہ جسم کے ساتھ ساتھ دل ودماغ بھی فتح کرلیے جاتے ہیں، اور ہاتھوں پیروں کے علاوہ عقلوں، دماغوں اور بصیرتوں سے بھی خط غلامی لکھالیا جاتا ہے، یہاں تک کہ غریب محکوموں کے پاس خیر وشر، حسن وقبح، ہنر وعیب کا معیار لے دے

کے بس یہی ایک رہ جاتا ہے کہ ''صاحب'' کی چشم التفات کدھر ہے؟ عزت بھی ''صاحب'' کی دی ہوئی اور دولت بھی سرکار کی مرحمت کی ہوئی، دین بھی وہیں کا عطیہ اور دنیا بھی وہیں کی بخشش، اب نہ ہندو ہندو ہے، نہ مسلمان مسلمان، سب رعایائے سرکار، اب نہ کوئی اللہ دین ہے نہ رام دین، بلکہ سب کے سب چھٹ چھٹا کر ''صاحب دین''۔

الفاظِ عمومی کو چھوڑ یئے، ستم یہ ہے کہ اعلام اور اسماء معرفہ تک یورپ زدگی کی وبا سے محفوظ نہیں۔ میاں ''کلو'' کو آپ نے اپنے ہاں جب دیکھا اکّہ بانی ہی کرتے پایا، لیکن میجر بلیک (Black) آپ کے شہر کے سول سرجن ہیں، ''کلومہتر'' آپ کے محلہ ہی میں رہتا ہے، لیکن پروفیسر ''بلیکی'' (Blackee) یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر ہیں! ''لالہ گھاسی رام'' بیچارے ''کانجی ہاؤس'' کی محرری سے عمر بھر آگے نہ بڑھ سکے، لیکن بریگیڈیر جنرل ''ہے'' (Hay) برطانوی فوج کے ایک مشہور ومعروف افسر ہیں! ''میاں رمضانی'' اور ''میاں شبراتی'' کی ساری عمر خدمت گاری میں گذری لیکن مسٹر ''مے'' (May) اور ڈاکٹر ''فرائڈے'' (Friday) پارلیمنٹ کے نامور ممبر ہیں! ''مٹھوا'' کہار اور ''طوطا'' کلوار آپ کی بستی ہی میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں، لیکن سر ''جان پارٹرج'' (Partridge) آپ کے صوبے کے گورنر تھے۔ مسٹر ''کاک'' (Cock) اس وقت آپ کے ضلع کے کلکٹر ہیں اور ''سوان'' (Swan) صاحب ابھی تبدیل ہو کر کمشنری پر گئے ہیں، آپ کی ماما کا لڑکا ''شیرا'' بیچارہ اب تک چپراسی کی جگہ امیدواری کر رہا ہے، لیکن ''بل'' صاحب (Bull) ترقی پا کر کمشنر ہو گئے اور مسٹر ''لیمب'' (Lamb) اور مسٹر ''کڈ'' (Kid) آپ ہی کے ضلع میں حاکم بندوبست اور جائنٹ مجسٹریٹ ہیں، ''دریاؤ سنگھ'' غریب کو لائن جمعداری سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا، سر جان ''لیک'' (Lack) دیکھتے دیکھتے ای، آئی، آر کے ایجنٹ ہو گئے! ''لالہ لوہاری مل'' کے چلائے عرائض نویسی کا کام بھی نہ چلا، جسٹس اسمتھ (Smith) ہائی کورٹ کی ججی پر پہنچ گئے! ''شیخ جھاؤ'' کی زندگی نوربانی کرتے کرتے ختم ہوگئی، سر چارلس ''ووڈ'' (Wood) حکومت ہند کے ہوم ممبر ہیں، جنگلی گھسیارہ بیچارہ عمر بھر گھاس ہی چھیلا کیا، سر جان ''فارسٹر'' (Forester) سنا ہے کہ امریکہ میں برطانیہ کے کونسل جنرل ہو گئے۔

❁❁❁

قسط اوّل

مسلم دنیا اور جدید فکری و تہذیبی چیلنجز

تحریر: ڈاکٹر سیّد حسین نصر
ترجمہ: ڈاکٹر سہیل عمر

مسلم دنیا اور جدید فکری و تہذیبی چیلنجز

آج کی صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ اگر کوئی شخص مغرب کی جانب سے اسلام کو دیے گئے چیلنجوں پر اور عمومی طور پر تہذیب جدید پر گفتگو کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے کام کا آغاز شمشیرِ فرقان کو ہاتھ میں لے کر ایک طرح کی فکری بت شکنی سے کرنا ہوگا اور ان تمام بتوں سے زمین کو پاک کرنا ہوگا جنھوں نے معاصر منظر نامے کو گدلا دیا ہے۔ جدید تہذیب، مغرب میں ہو یا مشرق میں اس کے طغیان کی صورت میں، اس بات پر نازاں ہے کہ اس سے تنقیدی ذہن اور معروضی تنقید کی قوت کا ارتقا ہوا ہے حالانکہ بنیادی طور پر یہ معلوم تہذیبوں میں سب سے کم تنقید مائل تہذیب ہے۔ یہ ایک ایسی تہذیب ہے جو سچے شعورِ امتیاز سے کوسوں ہٹی ہوئی ہے کیونکہ اس کے پاس وہ معروضی پیمانے نہیں ہیں جن سے یہ اپنی سرگرمیوں کا محاکمہ کر سکے۔ یہ ایک ایسی تہذیب ہے جو بنیادی اصلاح کی ہر سعی میں ناکام ہے کیونکہ یہ اپنی ہی اصلاح سے کام کا آغاز نہیں کر سکتی۔

ایک روایتی اسلامی ضرب المثل ہے کہ شیطان تیز دھار سے متنفر ہے۔ اس قدیم مقولے میں ایک گہری صداقت پوشیدہ ہے جو آج کی صورت حال پر براہ راست منطبق ہوتی ہے۔ چونکہ شیطان ہر جگہ موجود ہے سو وہ ہر جگہ تیکھے کناروں اور نوک کو کند کر کے، جن تک اس کی رسائی ہو سکتی ہے، اپنے اثرات ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ اس ماحول میں جس پر اس کے واضح اثرات موجود ہوں، حق و باطل کی واضح تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ اُصولوں کی تیز دھاریں گھس جاتی ہیں اور ان کا نکھرا سراپا بتدریج مدھم ہوتا چلا جاتا ہے۔ خیر و شر کا امتیاز پہلے سے زیادہ مبہم ہو جاتا ہے حتیٰ کہ مقدس رسوم، عبادات اور عقائد جو انسان پر خدا کی نہایت قیمتی

عنایات میں شمار ہوتی ہیں، اس فرسودہ کاراثر کی صورت میں جو ہر شے کو غیر واضح اور مبہم بناڈالتا ہے، بے ہیئت اور غیر معین ہوجاتی ہیں۔ پس جدید دنیا کی جانب سے اسلام کو پیش کیے گئے چیلنجوں پر گفتگو کرتے وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ فکری تنقیح وامتیاز کے اُن کڑے اور سخت گیر اُصولوں کو جن کی بنیاد ''شہادۃ'' پر ہو، کام میں لاتے ہوئے اس دھند کا پردہ چاک کیا جائے۔

اس شمشیرِ شہادت کا استعمال ضروری ہے تاکہ جاہلیت جدیدہ کے ان جھوٹے بتوں کو توڑا جا سکے جن کے سامنے ہمارے اکثر مسلمان، بغیر ان کی نوعیت کا اندازہ لگائے گھٹنے ٹیکتے چلے جارہے ہیں۔ اس شمشیر کا استعمال ضروری ہے تاکہ ان تمام باطل افکار اور خودساختہ نظاموں کا قلع قمع کیا جا سکے جن کی جدیدیت زدہ مسلمانوں کے ذہنوں پر پھپھوندی جم چکی ہے۔ یہ شمشیر معاصر مسلمان کی روح کی تراش خراش میں معاون ہوگی اور اسے ایک غیر متشکل ڈھیر سے ایک دمکتے بلور میں بدل دے گی جو نورِ ربانی سے مستنیر ہوتا ہے کیونکہ بلور اصل میں اپنے تیز اور واضح ترشے ہوئے کناروں کی بدولت ہی چمکتا ہے اور روشنی بانٹتا ہے۔

یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ آج کی صورت حال میں جدید دنیا پر، مابعد الطبیعیاتی اور مذہبی اُصولوں کے حوالے سے کی جانے والی تنقید اپنی عمیق ترین سطح پر ایک طرح کا کارِ خیر ہے اور اسلام کی سب سے مرکزی نیکیوں کے عین مطابق ہے۔ روایتی اسلامی زبانوں میں ''ادب'' کے مفہوم میں بیک وقت خوش اخلاقی، خوش اطواری، تمدن اور ادبیات سب شامل ہیں۔ چند مسلمان وہ بھی ہیں جو نقد و تنقیح سے اس لیے باز رہتے ہیں کہ مبادا انھیں غیر شائستہ اور ادب سے عاری نہ سمجھا جائے۔ ہمیں اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ پیغمبر اسلام نہ صرف یہ کہ ''ادب'' پر اس کی کلیت میں حاوی تھے بلکہ وہ حق وصداقت کو بغیر لگی لپٹی کے پیش فرماتے تھے۔ ان کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آئے جب انھوں نے انتہائی قطعی رویے کا اظہار فرمایا اور انھوں نے ادب پر صداقت کو کبھی قربان نہ فرمایا۔ اسلام نے کبھی اس بات کی تعلیم نہیں دی کہ انسان اتنا مودّب ہو کہ دو جمع دو کو پانچ تسلیم کرلے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''ادب'' حق کے ہر حالت اور ماحول میں، ادراک وادعا کی تکمیل کرتا ہے۔ ایک دفعہ شمالی افریقہ کی ایک ممتاز روحانی شخصیت نے کہا تھا: کیا تم جانتے ہو کہ ''ادب'' کیا ہے؟ اس کا مفہوم ہے اپنی تلوار کو دھار دینا تاکہ جب تمھیں کوئی عضو کاٹنا ہو تو زیادہ اذیت کے بغیر تراشا جا سکے۔

مسلمانوں کو مغرب کے بارے میں اور اسلام کے لیے اس کی دعوتِ مبارزت پر گفتگو کرتے ہوئے اسی قسم کے زاویۂ نگاہ کی ضرورت ہے۔ حق وصداقت کا نہ صرف یہ کہ ہماری جانوں اور جسموں پر حق ہے بلکہ اسے ہمیں یہ حکم دینے کا حق بھی حاصل ہے کہ ہم دوسروں کو دعوت خیر دیں اور جب اور جہاں بھی ممکن ہو

اس کی تشریح وتوضیح کریں۔آج ہمیں ناقد بننے کی ضرورت ہے۔خواہ سخت گیری کی حد تک ہی کیوں نہ ہو۔کیونکہ اب اس قسم کا رویہّ شاذ کے حکم میں داخل ہو گیا اور اس کی شدید ضرورت ہے۔

آج دنیائے اسلام میں جس چیز کی کمی ہے وہ جدید دنیا میں ہونے والے واقعات کا بھرپور معائنہ اور محتاط تنقید۔!!

اس قسم کی تنقید کے بغیر مغرب کا مقابلہ کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کبھی نہیں ہو سکتی۔جدیدیت زدہ مسلمانوں کے تمام ایسے بیانات جو اس پیش کش اور ادعائیت سے شروع ہوتے ہیں کہ:''اسلام اور فلاں فلاں شے میں تطبیق کا طریقہ''وغیرہ وغیرہ۔ناکامی کا منہ دیکھیں گے۔خواہ یہ فلاں کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ورنہ اسلام اور مغربی سوشلزم یا مارکسزم یا موجودیت یا ارتقائیت یا اسی قسم کی کسی بھی دوسری شے سے اسے تطبیق دینے کی تمام کوششیں اپنی تعمیر ہی میں صورتِ تخریب لیے ہوئے ہیں۔کیونکہ اس قسم کی کوششیں کرنے والے زیرِ نظر ازم یا نظام نامے کو اسلامی اُصولوں کی روشنی میں کلی طور پر پرکھے بغیر ہی اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔!!

اس ناکامی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ لوگ اسلام کو بجائے خود ایک مکمل ضابطۂ حیات اور تناظر نہیں سمجھتے۔ایسا تناظر جو اپنی جگہ مکمل ہے اور بنا بریں اسے کسی اور چیز کی نسبت اضافی یا نسبت توصیفی بنانے کا کوئی امکان نہیں خواہ اس چیز کو اسلام کی جگہ غیر شعوری طور پر مرکزی حیثیت دے دی گئی ہو۔یہ لوگ اسلام کو ایک ایسے نظامِ حیات کے طور پر دیکھتے ہیں جو اشیا کے بارے میں صرف جزوی زاویۂ نگاہ رکھتا ہے اور اسے کسی جدید نظریے سے مکمل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے آج کے رائج الوقت فیشنوں میں ہونے والی تیز تبدیلی،جس کے ذریعے ایک دن تو اسلامی سوشلزم قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور اگلے ہی روز لبرل ازم یا کوئی دوسرا مغربی''ازم''بجائے خود اس قسم کے زاویۂ نگاہ کی موجودگی اور سطحیت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔جو شخص بھی اسلام کے ڈھانچے کو اس کی کلیت میں سمجھتا ہے وہ جانتا ہے کہ اسلام کبھی خود کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ کسی ایسے نظام فکر کے مقابلے میں جو اس سے الگ اپنی حیثیت رکھتا ہو یا اس سے متصادم ہو،اس کی اپنی حیثیت محض ایک ترمیم کنندہ یا معاون کی ہو کر رہ جائے۔

مغرب کے کوکھ سے مختلف فیشن زدہ طرز ہائے فکر کم وبیش ایسی تیزی سے برآمد ہوتے رہتے ہیں جس تیزی سے موسموں میں تبدیلی آتی ہے۔ان کے مقابلے میں جدیدیت زدہ مسلمانوں نے جو دفاعی اور معذرت خواہانہ زاویۂ نگاہ اپنا رکھا ہے وہ ان کی تنقیدی حس اور فرقانی روح کی کمی ہی کا شاخسانہ ہے۔عام طور پر واضح کوتاہیوں پر یا ایسی کوتاہی جس پر تنقید کرنا آسان ہو،تنقید کی جاتی ہے لیکن کسی شخص میں یہ ہمت

نہیں کہ وہ کھڑے ہو کر ہمارے عہد کے بنیادی مغالطوں کو ہدف بنا سکے۔اس بات کی نشاندہی کرنا بڑا آسان ہے کہ روایتی مدارس میں طالب علموں کی زندگی حفظانِ صحت کے اُصولوں کے مطابق نہیں ہوتی لیکن اس بات پر ڈٹ جانا اور یہ کہہ گزرنا نہایت مشکل کام ہے کہ آج کے جدید تعلیمی اداروں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ طالب علموں کے نفوس کے لیے بے حد مہلک ہے، بمقابلہ بعض قدیم مدارس کی حفظانِ صحت کے اُصولوں سے عدم مطابقت رکھنے والی عمارات کے خطرات کے۔اسلامی دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد شاذ ہے جو مغرب کی آنکھ میں آنکھ ڈال سکیں اور عقل کلی اور روح کی شمشیر کے ذریعے اس کے اس چیلنج کی اصل و بنیاد کا جواب دے سکیں جو اسلام کو مغرب کی طرف سے درپیش ہے۔آج ایسی ہی حالت ہے لیکن ایسی صورت حال کو باقی نہیں رہنا چاہیے۔کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی دنیا میں ایک نئے فکری طائفے کی بنیاد نہ ڈالی جا سکے جو اسلامی وحی کے پیغام سے میسر ابدی اقدار کی روشنی میں جدید دنیا پر ایک معروضی تنقید کر سکے اور جدید انسان کی قابل رحم حالت پر (اور اس کی ہر لحظہ بڑھتی ہوئی قابل رحم حالت پر جس کا اسے سامنا ہے) خدا کے عطا کردہ اسلامی خزانوں کو لٹا سکے۔

جدید چیلنجز اور مختلف مسلم مکاتبِ فکر

اسلامی دنیا میں آج اصلاً افراد کے دو ہی طبقے موجود ہیں جن کا تعلق مذہبی، عقلی اور فلسفیانہ مسائل سے ہے یعنی طبقۂ علما جن میں عام طور پر دیگر مذہبی اور روایتی مستند لوگ (مثلاً صوفیا) شامل ہیں اور (دوسرا) متجددین کا وہ طبقہ جسے اب بھی مذہبیات سے دلچسپی ہے۔لیکن اب ایک تیسرا طبقہ بھی بتدریج وجود میں آ رہا ہے جو علما کی طرح روایتی بھی ہے مگر جدید دنیا سے بھی آگاہ ہے۔ جہاں تک علما اور دیگر روایتی روحانی شخصیات کا تعلق ہے تو وہ جدید دنیا اور اس کی پیچیدگی کا گہرا علم نہیں رکھتے۔لیکن وہ اسلامی روایت کے امین اور محافظ ہیں اور ان کے بغیر روایت کا تسلسل ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔جدیدیت زدہ لوگ ان پر معترض رہتے ہیں کہ وہ مغربی فلسفہ، سائنس اور جدید معاشیات اور اس قبیل کے دیگر علوم کی باریکیوں سے واقف نہیں لیکن یہ تنقید جو عموماً بڑی سہولت سے کر دی جاتی ہے اکثر و بیشتر غلط سمت میں ہوتی ہے۔گزشتہ صدی میں اسلامی دنیا میں سیاسی اور معاشی قوت پر جو لوگ حاوی تھے انھوں نے مدارس کو اس سمت میں پیش قدمی کرنے کا شاذ ہی موقع فراہم کیا کہ ان کے علماء جدید دنیا سے غلط اثرات قبول کیے بغیر اس سے بہتر طور پر واقف ہو سکیں۔چند مقامات پر جہاں مدرسے کے نصابات میں ترمیم کی کوششیں کی گئیں ان کی تہ میں بیشتر یہ مقصد پوشیدہ ہوتا تھا کہ کسی طرح روایتی نظامِ تعلیم کا حلیہ اس حد تک بگاڑ دیا جائے کہ اس کا

خاتمہ ہو سکے۔ نہ یہ کہ ان مدارس کے نصابات میں ایسے کورس شامل کیے جائیں جن کے باعث اسلامی تعلیمات کی روشنی میں طلبہ جدید دنیا سے متعارف ہو سکیں۔ علاوہ ازیں اس قسم کے ادارے بنانے کی کوشش نہ ہونے کے برابر کی گئیں جو روایتی مدارس اور جدید تعلیمی درس گاہوں کے درمیان پل کا کام دے سکیں۔ بہرحال جدیدیت پرستوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ علما کو ایسی چیزوں سے بے علمی کا طعنہ دے سکیں جن پر حاوی ہونے کا انھیں سرے سے کوئی موقع ہی فراہم نہ کیا گیا۔

جہاں تک دوسرے طبقے (جدیدیت پرست) کا تعلق ہے، وہ یا تو مغربی یونی ورسٹیوں کی پیداوار ہیں یا اسلامی دنیا کی ان یونی ورسٹیوں کی جو کم وبیش مغرب کی نقالی کرتی ہیں۔ اب قصہ یہ ہے کہ اسلامی دنیا کی یونی ورسٹیاں بجائے خود بحرانی حالت میں ہیں اور یہ بحران تشخص کے سوال سے اُبھر رہا ہے کیونکہ ایک نظامِ تعلیم کا تعلق نامیاتی طور پر اس کلچر سے ہوتا ہے جس کی آغوش میں یہ برسرِ عمل ہوتا ہے۔ ایک جیٹ طیارے کو آپ ایشیا یا افریقہ کے کسی بھی ملک کے ہوائی اڈے پر اتار سکتے ہیں اور اسے اس ملک کا حصہ گردانا جا سکتا ہے لیکن ایک نظامِ تعلیم کو آپ محض درآمد نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت کہ اسلامی دنیا میں جدید جامعات ایک ایسے بحران سے دوچار ہیں جو مغرب میں موجود جامعات کے بحران سے مختلف ہے، بذاتِ خود اس دعوے کا ثبوت ہے۔ اس بحران کا ہونا فطری تھا کیونکہ مقامی اسلامی کلچر ابھی زندہ ہے۔

مزید یہ کہ بحران زیادہ تر ان لوگوں کو شدید طور پر متاثر کرتا ہے جو ان جامعات میں تعلیم پاتے ہیں اور جنھیں عام طور پر ''طبقۂ دانشوراں'' Intellegensia کا نام دیا جاتا ہے۔ ''انٹلکچوئل'' کی طرح یہ اصطلاح بھی نہایت بدقسمت رہی ہے کیونکہ یہ جن لوگوں سے خاص ہے انھیں اکثر وبیشتر ''دانش'' کی ہوا بھی نہیں لگی لیکن بہرحال انھیں جس نام سے بھی پکارا جائے ان میں سے اکثر میں جو مغربی طرز کی جامعات کی پیداوار ہوتے ہیں ایک بات مشترک ہوتی ہے: ''ہر مغربی چیز کی شدید للک اور ان چیزوں کے سلسلے میں احساسِ کمتری جن کا تعلق اسلام سے ہو۔'' متعدد جدید ذہن کے مسلمانوں کا مغرب کے مقابلے میں یہ احساسِ کمتری، جو مسلمانوں کے علاوہ ان جدیدیت زدہ ہندوؤں، بدھوں اور ان دیگر مشرقیوں کے یہاں بھی عموماً پایا جاتا ہے جو بت پرستی کی جدید شکلوں کی آشفتہ مغزی Psychosis کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ مرضِ عظیم ہے جو اسلامی دنیا کو درپیش ہے اور وہ اسی گروہ کو سب سے زیادہ دق کر رہا ہے جس کے بارے میں توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ مغرب کے چیلنج کا مقابلہ کر سکے گا۔ چنانچہ اسلام کی مغرب کے ساتھ مبارزت کا مسئلہ اس وقت تک زیرِ بحث نہیں آ سکتا جب تک اس ذہنیت کو نگاہ میں نہیں رکھا جاتا جو بیشتر صورتوں میں جدید یونی ورسٹی تعلیم کی پیداوار ہے۔ ایک ایسی ذہنیت جو پچھلی صدی میں اکثر وبیشتر ان معذرت خواہانہ

اسلامی ''تصانیف'' کی ذمہ دار ہے جو اسلام اور مغرب کے تصادم سے متعلق ہیں۔

اسلام اور مغرب کے تصادم سے پیدا شدہ بحران کے سلسلے میں اس معذرت خواہانہ، جدیدیت زدہ رویے میں کوشش یہ ملتی ہے کہ مغرب کے چیلنج کے جواب میں کھینچ تان کر کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کر دیا جائے کہ اسلام کا یہ اور وہ عنصر مغرب میں اس وقت رائج فلاں فلاں صورت سے مطابقت رکھتا ہے جب کہ اسلام میں موجود بعض دیگر عناصر کے سلسلے میں، جن کے لیے تخیل کی طویل اُڑان کے باوجود مغرب سے کوئی مثال دستیاب نہ ہو سکی ہو، صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دی جاتی ہے کہ یہ غیر اہم ہیں یا پھر مابعد کے غیر متعلق الحاقات۔

اس طرح اسلامی عبادات کی صحت بخش نوعیت اور پیغام اسلام کے مساویانہ کردار کو ثابت کرنے کے لیے لا طائل مباحث پیش کیے گئے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ یہ چیزیں خود اسلام کے کلی پیغام کے وسیع تناظر میں دیکھے جانے پر درست ہیں بلکہ اس لیے کہ ''حفظانِ صحت'' اور ''مساوات'' کے خیالات اس وقت مغرب کے مسلمہ افکار و معیار مانے جاتے ہیں۔ اس قسم کی واضح اور آسانی سے قابل دفاع خصوصیات کی توثیق کر کے، ان معذرت خواہوں نے مغرب کے کلی چیلنج سے صرفِ نظر کرنے کی کوشش کی ہے جس کے باعث اسلام کا قلب خطرے میں پڑ گیا ہے اور دشمن کے غصے کو کم کر کے اس خطرے کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ جب سرجری کی ضرورت ہو تو ایک نشتر ناگزیز ہو جاتا ہے جس کی مدد سے فرسودہ حصے کو الگ کیا جا سکے۔ اسی طرح جب باطل مذہبی صداقت کی سلامتی کے لیے خطرہ بن رہا ہو تو اس صورت میں کوئی شے تنقید اور تنقیح کی تلوار کا بدل نہیں ہو سکتی۔ کوئی شخص بھی باطل سے صلح کر کے اور اسے اپنا دوست بتا کر اس کے منفی اثر کو زائل نہیں کر سکتا۔

یہ معذرت خواہانہ طرز فکر اس صورت میں اور زیادہ افسوسناک ہو جاتا ہے جب یہ اپنا رشتہ فلسفیانہ اور فکری سوالات سے جوڑتا ہے۔ جب ہم اس قسم کا معذرت خواہانہ لٹریچر پڑھتے ہیں جو اس صدی کے آغاز میں زیادہ تر مصر اور برصغیر ہندوستان میں پیدا ہوا اور جس میں مذہب اور سائنس کے سلسلے کے انتہائی فرسودہ اور مردہ مباحث کی جگالی کی جاتی تھی جو وکٹورین انگلستان اور اسی دور کے فرانس میں ہوتے تھے اور اب اہمیت کھو چکے تھے تو اس قسم کے لٹریچر کی کمزوری واضح ہو جاتی ہے جو اصل میں مغرب کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے وجود میں لایا گیا تھا بلکہ اس وقت سے لے کر اب تک کے گزرنے والے دسیوں سالوں کے تناظر میں تو ایسا لٹریچر اور بھی فرسودہ لگنے لگا ہے۔ بہر حال اُس زمانے میں روایتی علما کی ٹھوس آواز سننے میں ضرور آ جاتی تھی جنھوں نے اپنے استدلال کو وحی الٰہی کے غیر مبدل اُصولوں پر ڈھال کر مذہبی سطح پر ان چیلنجوں کا جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ بے شک وہ ان مباحث میں کارفرما مشہور فلسفیانہ اور مجرد افکار سے زیادہ واقفیت بھی نہ رکھتے تھے۔ یہ آواز نابود تو نہیں ہوئی لیکن رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی گئی اور اس کے

مقابلے میں جدیدیت پرستوں کی آواز بلند سے بلندتر اور جاری ہوتی چلی گئی۔

اس واقعہ نے آج یہ افسوسناک صورت حال پیدا کر دی ہے کہ پڑھے لکھے طبقوں میں جدید تہذیبِ مغرب کے انتہائی گرم جوش وفاع کرنے والے عملاً وہ لوگ ہیں جو مغرب زدہ مشرقی ہیں۔ آکسفورڈ اور ہارورڈ میں پڑھنے والے انتہائی ذہین طالب علم بھی تہذیب مغرب اور اس کے مستقبل کے معاملے میں اتنے پُر اعتماد نہیں جتنے یہ ہمارے مغرب زدہ مشرقی جنھوں نے کچھ عرصے سے اپنا سب کچھ جدیدیت کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دیا ہے اور اب انھیں اپنے بت کی مکمل شکست وریخت کے امکان کا اچانک سامنا ہے۔ چنانچہ وہ اب اس بت سے چمٹنے کے لیے ہر طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ جدیدیت زدہ مسلمانوں کے لیے خصوصاً ان مسلمانوں کے لیے جو ان میں زیادہ انتہا پسند ہیں اسلام کا ''حقیقی مفہوم'' ادھر کچھ عرصہ سے وہ ہو چلا ہے جو انھیں مغرب نے پڑھایا ہے۔ اگر ''نظریۂ ارتقا'' کا چلن ہے تو سچا اسلام ارتقائی ہے۔ اگر سوشلزم کا کوس بج رہا ہے تو پھر اسلام کی ''حقیقی تعلیمات'' سوشلزم ہی پر مبنی ہیں۔ اس ذہنیت اور اُس ذہنیت کے نتیجے میں پیدا شدہ تصنیفات کا شعور رکھنے والے لوگ اس کی ممیاتی ہوئی، غلامانہ اور جامد فطرت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اور تو اور قانون کے میدان میں بھی بارہا ایسا ہوا کہ قطعی غیر اسلامی بلکہ دشمن اسلام قوانین کو آغاز میں بسم اللہ اور آخر میں بہ نستعین کا اضافہ کر کے اپنا لیا گیا جب کہ ان دونوں مقدس کلمات کے درمیان پایا جانے والا مواد کسی نہ کسی مغربی ضابطۂ فوجداری و دیوانی سے ماخوذ بلکہ نقل شدہ تھا۔

اب اچانک اس گروہ کی آنکھوں کے سامنے جو مغرب کی پیروی میں اپنی روح کا سودا کرنے کی سوچ رہا تھا، خود اسی مغربی تہذیب کی لڑکھڑاہٹ کا ناقابل یقین منظر گھوم رہا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ کتنا دردناک منظر ہوگا؟ چنانچہ وہ تمام حقائق سے صرفِ نظر کرتے ہوئے مغربی نظامِ اقدار کے دفاع کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں اور ان مغربی مفکرین پر غضب ناک ہو جاتے ہیں جنھوں نے خود جدید مغرب کو ہدف تنقید بنانا شروع کر دیا ہے۔ اگر جدید تہذیب کی یہ واضح ٹوٹ پھوٹ جو جنگ عظیم دوم کے بعد زیادہ کھل کر سامنے آنے لگی تھی، پہلی عالمی جنگ کے بعد ہی واضح ہو کر سامنے آ جاتی جب ابھی ایشیا کی روایتیں کہیں زیادہ محفوظ تھیں تو امکان غالب ہے کہ ان روایتی تہذیبوں کا کہیں زیادہ حصہ بچایا جا سکتا تھا لیکن تقدیر کے ہاتھوں نے انسان کے لیے ایک اور رستے کی نقش گری کرنا تھی۔ بہر حال آج کی صورت حال میں بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے جیسا کہ ایک فارسی ضرب المثل کا مفہوم ہے کہ جب تک درخت کی جڑ میں پانی موجود ہے بہتری کی امید کی جا سکتی ہے۔ (جاری)

ایامِ بیض کی تحقیق

مولانا ندیم احمد انصاری

احادیثِ مبارکہ کے مطابق نوافل کے ذریعے انسان کو اللہ تعالیٰ کا قربِ خاص نصیب ہوتا ہے، اس لیے ہر شخص کو چاہیے کہ حسبِ موقع واستعداد نفلوں کا اہتمام کرے۔ خواہ صوم وصلوٰۃ کی صورت میں ہو یا صدقہ وخیرات کی صورت میں۔

ہر ماہ تین روزے رکھنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ مبارکہ ہے، جس پر فی زمانہ بہت کم عمل درآمد کیا جاتا ہے۔ جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ قمری تاریخ کا استعمال جو کہ فرضِ کفایہ ہے، کم کرتے ہیں، اور بعض دفع سولہ تاریخ کو خیال آتا ہے کہ ایامِ بیض کے روزے رکھنے تھے۔ پھر معاملہ آیندہ پر ٹال دیا جاتا ہے اور پھر سہو ونسیان یا غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے مضمونِ ہذا میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جمہور کے اصل مذہب کے مطابق بہتر تو یہی ہے کہ قمری مہینے کی تیرہ، چودہ، پندرہ تاریخ کو ایامِ بیض کے روزے رکھے جائیں، البتہ اکابر علما کی صراحت کے مطابق اگر کوئی شخص مہینے کے دیگر دنوں میں بھی تین دن روزے رکھ لے تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ ایامِ بیض کے روزوں کا ثواب عنایت فرما دیں گے۔ اس لیے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

سنتوں کی دو قسمیں

خلاصۂ کائنات حضرت محمد مصطفی احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک ادا اللہ سبحانہ وتقدس کو نہایت محبوب ہے، اسی لیے ارشاد فرمایا: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ البتہ امت کی آسانی کے لیے سننِ نبویہ کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ فقہاء کرامؒ نے لکھا ہے کہ سنت کی دو قسمیں ہیں: (۱) سنتِ ہدیٰ (۲) سنتِ زائدہ۔

وہ امور جن کا ثبوت بہ طورِ عبادت، اہتمام کے ساتھ ہو، اور وہ فرائض وواجبات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے والے ہوں، جیسے: اذان واقامت اور جماعتِ نماز وغیرہ، انھیں 'سنتِ ہدیٰ' کہتے ہیں۔ وہ امور جن کا ثبوت یا تو بہ طورِ عادت ہو، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں بہ طورِ عبادت ہی کیا ہو، لیکن وہ فرض

وواجب کے لیے تکمیل کا ذریعہ نہ ہوں اور پابندی کی وجہ سے عادت ہی کے درجے میں ہو گئے ہوں، جیسے نماز میں رکوع وسجدہ وغیرہ کو طویل کرنا۔ یہ سب 'سنتِ زائدہ' کے حکم میں ہے۔(مستفاد اصولِ فقہ: ۳۴-۳۳)

یہاں ہم بعض مسنون روزوں یعنی ایامِ بیض کے روزوں سے متعلق گفتگو کریں گے، جس میں تحقیق طلب امر یہ ہے کہ آیا قمری مہینے کی تیرہ چودہ پندرہ تاریخ کے روزے ہی ایام بیض ہیں، یا کوئی بھی تین دن روزے رکھنے سے یہ ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے؟

مسنون روزے

واضح رہے کہ روزوں میں سنتِ مؤکدہ کوئی روزہ نہیں، لیکن جن دنوں میں رسول اللہ ﷺ نے روزہ رکھنے کی ترغیب دی ہے، انہیں سنت کہتے ہیں۔سنت روزے مندرجہٗ ذیل ہیں: (۱) عاشوراء کے دو روزے، یعنی محرم کی نویں اور دسویں تاریخ، یا دسویں اور گیارہویں کا روزہ۔ **يعم السنة كصوم عاشوراء مع التاسع ۔ويستحب أن يصوم يوم عاشوراء بصوم يوم قبله أو يوم بعده ليكون مخالفاً لأهل الكتاب۔** (شامی: ۳/ ۳۰۰) (۲) عرفہ یعنی ذی الحجہ کی نویں تاریخ کا روزہ۔ **والمندوب بالنصب عطف على السنة... وعرفة ولو لحاج لم يضعفه۔** (شامی: ۳/ ۳۰۱) (۳) ایامِ بیض یعنی ہر قمری مہینے کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کے روزے۔ **وأما المندوب فهو صوم ثلاثة من كل شهر ويندب كونها الأيام البيض وهي الثالث عشر، والرابع عشر، والخامس عشر۔** (مراقی الفلاح: ۲۳۰، طحطاوی: ۶۳۹ علی المراقی)

ایامِ بیض کی تعیین میں اختلاف

ہر ماہ تین روزے رکھنا بالاتفاق مسنون ومستحب ہے، البتہ دن کی تعیین میں اختلاف ہے۔قاضی ثناء اللہ پانی پتی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: در ہر ماہ سہ روزہ داشتن مسنون است گاہے پیغمبر ﷺ روزۂ ایام بیض سیزدہم چہاردہم یا پانزدہم داشتہ وگاہے اول ماہ وگاہے آخر ماہ وگاہے در ہر عشرہ یک روزہ الخ۔ (مالابد منہ: ۹۵)

حضرت شیخ الحدیثؒ کا فرمان

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ تین کی تعیین میں مختلف روایات وارد ہوئی ہیں، لیکن کوئی مخالفت نہیں۔کبھی حضور اقدس ﷺ مہینہ کے شروع ہی میں تین روزے رکھ لیتے

تھے، کبھی ہر جمعرات کو، کبھی تیرہ، چودہ، پندرہ کو، ایسے ہی اور مختلف اوقات میں۔ (خصائل نبوی: ۲۵۵)

جمہور کا موقف

تاہم جمہور فقہاءِ احناف، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک تیرہ، چودہ، پندرہویں تاریخ کے ایام ہیں انہیں ہی 'ایام بیض' کہتے ہیں۔

كذا في الخانية: ويستحب صوم أيام البيض الثالث عشر والرابع عشر والخامس عشر۔(قاضي خان: ۲۰۵/۱)وفي المجموع:واتفق أصحابناعلى استحباب صوم أيام البيض، قالوا هم وغيرهم: وهي اليوم الثالث عشروالرابع عشرو الخامس عشر،هذا هواالصحيح المشهور، الخ۔(المجموع: ۱۴۸۰/۲) وفي المغني: قال: وأيام البيض التي حض رسول الله ﷺ على صيامها، وهي الثالث عشر والرابع عشر والخامس عشر۔ وجملة ذلك ان صيام ثلاثة ايام من كل شهر مستحب، لانعلم فيه خلافاً۔(المغني لابن القدامه: ۶۳۰/۱)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تصریح ہے۔ حدثنا محمود بن غيلان حدثنا أبو داؤد قال انبأنا شعبة عن الاعمش قال: سمعت يحيىٰ بن بسام يحدث عن موسى بن طلحة قال؛ سمعت أبا ذر يقول: قال رسول الله ﷺ: يا ابا ذر، اذا صمت من الشهر ثلاثة ايام فصم ثلاث عشرة واربع عشرة وخمس عشرة۔ حضرت موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! اگر تم مہینے میں تین دن روزہ رکھو تو تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کو روزہ رکھا کرو۔ اس باب میں ابوقتادہ، عبداللہ بن عمر، قرہ بن ایاس مزنی، عبداللہ بن مسعود، ابوعقرب، ابن عباس، قتادہ بن ملحان، عائشہ، عثمان بن ابوالعاص اور جریر سے بھی روایت ہے، رضی اللہ عنہم اجمعین۔ وفي الباب عن ابي قتادة وعبد الله بن عمرو وقرة بن اياس المزني وعبد الله بن مسعود وأبي عقرب وابن عباس عائشة وقتادة بن ملحان وعثمان بن أبي العاص وجرير۔ نیز امام ابوعیسیٰ ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے۔ قال أبو عيسىٰ: حديث ابي ذر حديث حسن۔ بعض روایات میں ہے کہ جو شخص ہر ماہ تین روزے رکھے، وہ ایسا ہے جیسے پورے سال روزے رکھے۔ وقدروى في بعض الحديث أن من صام ثلاثة أيام من كل شهر كان كمن صام الدهر۔ (ترمذی: ۷۶۱)

امام بخاری علیہ الرحمہ نے ان ہی دنوں کا ترجمۃ الباب منعقد کیا ہے۔ (صحیح البخاری، باب صیام

البیض ثلاث عشرۃ، وأربع عشرۃ وخمس عشرۃ: ۱/ ۲۶۶) اور اس باب کے تحت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت لائے ہیں:

ہر ماہ تین روزوں کا ثواب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے میرے خلیل ﷺ نے ہر مہینے تین روزے رکھنے کی وصیت کی۔ **حدثنا ابو معمر، حدثنا عبدالوارث، حدثنا ابو التیاح قال، حدثنی أبو عثمان، عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: أوصانی خلیلی ﷺ بثلاث: صیام ثلاثہ أیام من کل شہر الخ۔ (صحیح البخاری: ۱۹۸۱، ۱۱۷۸، اخرجہ مسلم: ۷۲۱)**

ماہانہ تین روزوں پر حضرت نبی کریم ﷺ مزید ترغیب دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر ماہ پابندی سے تین روزے رکھنے والے کو پورے زمانے یعنی پورے سال روزہ رکھنے کا ثواب ملے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہر مہینہ تین روزے رکھے گا، اور ہر نیکی کا بدلہ اس امت کو دس گنا دیا جاتا ہے، تو تین روزوں کا ثواب تیس روزوں کے برابر ہوجائے گا اور اس کی ہر ماہ پابندی کرنے والا ایسا ہوجائے گا جیسا ہمیشہ روزے رکھنے والا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر مہینہ میں تین دن روزے رکھنا، پورا سال روزے رکھنے کے برابر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں اپنی کتاب (میں یہ آیت) نازل فرمائی 'من جاء الخ۔ جو ایک نیکی لائے گا اس کے لئے دس نیکیوں کا ثواب ہے۔ لہٰذا ایک دن (ثواب کے اعتبار سے) دس دنوں کے برابر ہوا۔ **حدثنا ھناد ابو معاویۃ عن عاصم الاحول عن أبی عثمان النہدی عن أبی ذر قال: قال رسول اللہ ﷺ: من صام من کل شہر ثلاثۃ ایام فذلک صیام الدھر فأنزل اللہ عز وجل تصدیق ذلک فی کتابہ "من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا" الیوم بعشرۃ أیام۔ قال ابو عیسیٰ ھذا حدیث حسن۔ قال أبو عیسیٰ وروی شعبۃ ھذا الحدیث عن أبی شمر وأبی التیاح عن ابی عثمان وقال عن أبی ہریرۃ عن النبی ﷺ۔ (ترمذی: ۲۴۰۸)**

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر مہینہ میں تین روزے ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک، یہ سارے سال کے روزوں کے برابر ہیں۔ **ثلاث من کل شہر ورمضان إلی رمضان فھذا صیام الدھر کلہ۔** (مسلم، باب استحباب صیام ثلاثۃ أیام من کل شہر: ۱/ ۳۶۷)

روایات مختلف ہیں

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: بعض روایات میں ہر مہینے کے شروع میں روزے رکھنے کا حضور ﷺ کا معمول ذکر کیا گیا ہے، اور بعض روایات میں مہینہ کی تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں کا، اور بعض روایات میں ہفتہ کے خاص خاص تین دنوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، لیکن ان میں سے کوئی بھی؛ آپ ﷺ کا دوامی معمول نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ آپ ﷺ کو سفر اور اس کے علاوہ بھی دوسری چیزیں بہ کثرت پیش آتی رہتی تھیں، جس کی وجہ سے آپ ﷺ کے لیے خاص تاریخوں یا دنوں کی پابندی مناسب نہیں تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کا خاص تاریخوں اور خاص دنوں میں ہمیشہ روزے رکھنا امت کے مختلف الحال لوگوں کے لیے باعثِ زحمت ہوتا اور اس سے غلط فہمی بھی ہوسکتی تھی کہ یہ روزے واجبات میں سے ہیں۔ الغرض! اس طرح کی مصلحتوں کی وجہ سے آپ ﷺ خود خاص تاریخوں اور دنوں کی پابندی نہیں فرماتے تھے اور آپ ﷺ کے حق میں یہی افضل اور اولیٰ تھا، لیکن صحابہ کرامؓ کو آپ ﷺ، مہینے کے تین دن کے روزوں کے سلسلے میں اکثر ایامِ بیض (۱۵، ۱۴، ۱۳ تاریخ) کی ترغیب دیتے تھے۔ (معارف الحدیث: ۴/ ۳۸۴ بتصرف) اور علامہ قطب الدین محدث دہلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: پورے سال میں مسنون و مستحب روزوں کی تعداد اکیاون ہے۔ تینتیس ۳۳/ روزے تو یہی ایام بیض کے ہوگئے بحساب تین روزہ فی مہینہ، ۹/ روزے ذی الحجہ کے مہینہ میں، پہلی تاریخ سے نویں تاریخ تک، ایک یومِ عاشورہ کا، ایک یوم عاشورہ کے ساتھ پہلے یا بعد کا، ایک شعبان کی پندرہویں تاریخ کا اور چھ روزے ماہِ شوال کے۔ (مظاہر حق جدید: ۲/ ۳۷۳، عمدۃ الفقہ: ۳/ ۱۱۰) واللہ اعلم بالصواب

۞۞۞

بیماری آزمائش ہے اور تن درستی ہزار نعمت!

مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی

ہر انسان اپنی زندگی میں مختلف حالات وسانحات سے دوچار ہوتا ہے، بہت سارے نشیب وفراز سے گزرتا ہے اور لاتعداد مصائب وآلام، انگیز کرتا ہے، صحت وبیماری، قوت وکمزوری، راحت وتلخی، مسرت وغمگینی، اسارت وآزادی، وسعت وتنگ معاشی وغیرہ جیسے متضاد مراحل کو طے کرتا ہوا منزل آخر تک جا پہنچتا ہے، یہ سب درحقیقت رب العالمین کی جانب سے بندوں کے لیے ابتلا وآزمائش، ان کے معاصی کا کفارہ اور بلندیٔ درجات کا سبب ہیں۔

جب کبھی انسان پر خلاف منشا کچھ حالات آئیں تو اسے خندہ پیشانی سے قبول کرنا چاہیے، صبر وشکر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے، جزع فزع اور تقدیر پر شکوے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ یہی بندگی کا تقاضا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔ بے صبری کا مظاہرہ کرنے اور تھک ہار کر مایوس ہوجانے سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ مسلمان پر جب کوئی مصیبت، دکھ اور پریشانی آئے تو اس سے اس کے گناہ معاف اور درجات بلند ہوتے ہیں، حتیٰ کہ اگر اسے ایک کانٹا چبھے تو یہ بھی خطاؤں کی معافی اور رفع درجات کا سبب بنتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مومن کی مثال لہلہاتی ہوئی نرم ونازک کھیتی کی مانند ہے، کسی طرف سے بھی آنے والی ہوا اسے جھکا دیتی ہے، جب وہ سیدھی ہوتی ہے تو اسے دوبارہ کسی مشکل اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس فاجر آدمی کی مثال صنوبر کے سیدھے اور مضبوط درخت کی مانند ہے (جو ہوا کے جھونکوں سے سرنگوں نہیں ہوتا، بلکہ) اللہ جب چاہے اسے اکھاڑ پھینکتا ہے"۔ (صحیح بخاری)

اس وقت ڈینگی، ملیریا، ٹائیفیڈ اور اس قبیل کی متعدد خطرناک بیماریاں، وبائی شکل میں انسانی معاشرہ پر حملہ آور ہیں، دنیا کو ان مہلک ترین بیماریوں نے اپنے شکنجے میں لے رکھا ہے، ہزاروں لوگ دواخانوں میں شریک اور علاج ومعالجے کے لیے پریشان ہیں۔ بیماروں کی ایک بڑی تعداد وہ بھی ہے جنہیں ہسپتالوں میں رات گزارنے کے لیے چھت تک میسر نہیں اور سیکڑوں افراد ایسے بھی ہیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں۔ خانگی ہسپتالوں کی بے حسی اور انسانیت بے زاری کا یہ عالم ہے کہ معمولی جانچ اور ابتدائی دوادارو

کے لیے بھی ہزاروں روپیے کے نامعقول مطالبات ہیں؛جنہیں پورا کرنا عام انسان کے بس سے باہر ہے۔**اللھم احفظنا من کل بلاء الدنیا وعذاب الآخرۃ**

مومن کے لیے بیماری بھی رحمت ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو بہت سی نعمتوں سے سرفراز فرمایا ان میں سے کچھ نعمتیں ایسی بھی ہیں جو انسان کو زحمت معلوم ہوتی ہیں حالاں کہ وہ بھی رحمت ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی بھلائی کے لیے اتاری گئی ہیں۔تن درستی اور بیماری یہ دونوں انسان کے لیے بالکل قدرتی چیزیں ہیں،انسان صحت مند بھی رہتا ہے،بیمار بھی ہوتا ہے اور یہ اس کی زندگی کی علامت ہے؛ کیوں کہ غیر جاندار چیزیں بیمار نہیں ہوتیں ؛بل کہ جان دار بیمار ہوتا ہے۔معلوم ہوا کہ صحت اور بیماری جان دار کی خاصیت ہے،یہ نہ مایوس ہونے کی چیز ہے اور نہ نفرت کرنے کی،صحت اللہ کی طرف سے بندے کے لیے ایک راحت ہے تو بیماری بھی اللہ کی طرف سے ایک نعمت ہے،جس طرح سے صحت میں انسان کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اسی طرح بیماری میں بھی صبر سے کام لینا چاہیے۔سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مومن کا معاملہ تو تعجب خیز ہے کہ اس کا ہر کام خیر پر مبنی ہے اور یہ اعزاز صرف مومن ہی کو حاصل ہے۔اگر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے تو وہ اس پر اللہ کا شکر بجالاتا ہے،اور یہ شکر بجالانا اس کے لیے نہایت مفید ہے اور اگر اسے کوئی مصیبت یا پریشانی لاحق ہوتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے۔اس صبر کرنے میں بھی اس کے لیے خیر وبرکت ہے۔(صحیح مسلم)

اس کے علاوہ مومن کو اس دنیا میں جسمانی طور پر مختلف عوارض میں مبتلا کیے جانے پر بھی کئی ایک فضیلتیں احادیث مبارکہ میں وارد ہوئی ہیں۔چند حدیثیں ملاحظہ فرمائیں!

حضرت ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں،نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:”کسی مسلمان کو کوئی بھی بیماری،تکلیف،تھکاوٹ،غم،پریشانی یا ایذا وغیرہ لاحق ہو،حتیٰ کہ اگر اسے کانٹا بھی چبھے تو اللہ تعالیٰ اس تکلیف کے عوض اس مومن کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔“(مسلم)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے،نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ”کسی مسلمان کو کوئی مرض یا دیگر کوئی تکلیف لاحق ہو تو اس کے سبب اور اس کے عوض اللہ تعالیٰ اس کے گناہ یوں گرا دیتا ہے جیسے درخت کے پتے گرتے ہیں۔“(بخاری)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے،نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ”اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی بندے کے لیے ایک بلند مرتبہ مقدر ہوتا ہے؛مگر وہ بندہ کوئی عمل کر کے اس مرتبہ کو حاصل نہیں کر پاتا تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی مرضی وپسند کے خلاف اس حد تک آزماتا رہتا ہے کہ اس کے بدلے وہ

بندہ اس مرتبہ کا مستحق ہوجاتا ہے۔“

حضرت ابودرداء سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”مومن سر درد وغیرہ میں مبتلا رہے اور اس کے گناہ کثرت میں اُحد پہاڑ جتنے بھی ہوں۔تو بیماری کے سبب اس کے ذمہ کوئی معمولی گناہ بھی باقی نہیں رہتا اور مومن کو ان بیماریوں اور تکالیف کی قدرومنزلت اور فضیلت کا اندازہ قیامت کے دن ہوگا جب پردے ہٹ جائیں گے۔“(صحیح ابن حبان)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ:”دنیا میں آزمائشوں،تکالیف ومصائب میں مبتلا رہنے والوں کو جب قیامت کے دن بے حد وحساب اجروثواب سے نوازا جائے گا تو دنیا میں خوش حالی اور صحت وتن درستی کی زندگی گزارنے والے لوگ خواہش کریں گے کہ اے کاش! دنیا میں ہماری جلد اور جسم کو قینچیوں سے کاٹا جاتا اور ہم بھی آج یہ عظیم القدر ثواب حاصل کرسکتے۔“(جامع ترمذی)

نعمتِ صحت کی قدر کریں!

یوں تو بیماری اور شفا اللہ رب العزت کے قبضہ قدرت میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے بیماری میں مبتلا کردیتا ہے اور جسے چاہتا ہے صحت جیسی عظیم الشان نعمت سے سرفراز فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کے ساتھ ساتھ اس کا علاج بھی نازل فرمایا ہے، جیسے کہ ارشادنبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:”اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کی دوا نازل کی ہے، یہ الگ بات ہے کہ کسی نے معلوم کرلی اور کسی نے نہ کی۔“(مستدرک حاکم) لیکن اس کے باوجود متعدد احادیث میں حفظانِ صحت پر بہت زور دیا گیا ہے۔اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن انسان سے سب سے پہلے جن نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا،ان میں سرِ فہرست صحت ہے۔(جامع ترمذی) لیکن بدقسمتی سے اس بیش بہا نعمت کی کما حقہ قدر نہیں کی جاتی اور اس کے سلسلے میں غفلت برتی جاتی ہے۔ مال ودولت اور جائداد کی اہمیت سے تو ہر ایک واقف ہوتا ہے؛ لیکن جس چیز کے ذریعہ یہ تمام چیزیں میسر آتی ہیں یا جس کے ذریعہ ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اس کو برقرار رکھنے اور اس کی حفاظت کے لیے کسی قسم کی احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی ہے۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:”دو نعمتیں ایسی ہیں جن سے اکثر لوگ غفلت میں رہتے ہیں:صحت اور فرصت“۔(بخاری) علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اس حدیث پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مکلف انسان کو ایسے تاجر کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کے پاس بنیادی سرمایہ ہوتا ہے اور وہ اُس کو سلامت رکھنے کے ساتھ اُس پر نفع بھی کماتا ہے۔ایسے تاجر کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ جس سے معاملہ کرتا

ہے پورے غور وفکر سے کام لیتا ہے اور اپنے معاملات میں سچائی اور مہارت کو لازم پکڑتا ہے، تاکہ اُس کو نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ پس صحت اور فراغت تو انسان کا اصل سرمایہ ہیں اور اس کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان نفس کے خلاف کوشش اور دین کے دشمنوں کے خلاف جہاد کے ذریعے معاملہ کرے۔ تاکہ وہ دنیا وآخرت کی خیر نفع میں حاصل کر لے۔

الغرض: ہمیں صحت وتن درستی جیسی اہم ترین نعمت کی قدر کرنی چاہیے؛ کیوں کہ جب تک صحت سلامت ہے ہم دنیوی ذمہ داریوں کو بھی بہ حسن وخوبی پورا کر سکتے ہیں اور آخرت کے لیے بھی ذخیرہ اندوزی کی کام یاب کوشش کر سکتے ہیں۔

دعاؤں کا اہتمام کریں!

امراض سے حفاظت کے لیے جہاں فرائض کا اہتمام نہایت ضروری ہے وہیں مختلف منقول دعاؤں کا معمول بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ جیسے معوذتین کے سلسلہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: "رسول اللہ ﷺ جب بیمار پڑتے تو اپنے اوپر معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پڑھ کر دم کر لیا کرتے تھے اور اپنے جسم پر اپنے ہاتھ پھیر لیا کرتے تھے، پھر جب وہ مرض آپ کو لاحق ہوا جس میں آپ کی وفات ہوئی تو میں معوذتین پڑھ کر آپ پر دم کیا کرتی تھی اور ہاتھ پر دم کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم پر پھیرا کرتی تھی۔" (بخاری شریف) اسی طرح حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جو شخص تین بار "**بسم الله الذی لا یضر مع اسمه شیء فی الارض ولا فی السماء وهو السمیع العلیم**" اللہ کے نام کے ساتھ، جس کے نام کے ساتھ زمین وآسمان میں کوئی چیز نقصان نہیں پہنچاتی اور وہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔" کہے تو اسے صبح تک اچانک کوئی مصیبت نہ پہنچے گی اور جو شخص تین مرتبہ صبح کے وقت اسے کہے تو اسے شام تک اچانک کوئی مصیبت نہ پہنچے گی۔" راوی حدیث ابومودود کہتے ہیں: پھر راوی حدیث ابان بن عثمان پر فالج کا حملہ ہوا تو وہ شخص جس نے ان سے یہ حدیث سنی تھی انہیں دیکھنے لگا، تو ابان نے اس سے کہا: مجھے کیا دیکھتے ہو، قسم اللہ کی! نہ میں نے عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف جھوٹی بات منسوب کی ہے اور نہ ہی عثمان نے رسول اللہ ﷺ کی طرف؛ لیکن بات یہ ہے کہ جس دن مجھے یہ بیماری لاحق ہوئی اس دن مجھ پر غصہ سوار تھا اور غصے میں اس دعا کو پڑھنا بھول گیا تھا۔

بیماروں کی مزاج پرسی کریں!

حالات کی مناسبت سے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ہم عیادت کی سنت کو زندہ کریں! بلاتفریق

مذہب وملت انسانوں کی مزاج پرسی کریں، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور دوست احباب میں جو بیمار ہیں ان کی خبر گیری کرتے رہیں، ساتھ ہی حتی الوسع ان کا تعاون کریں اور یادرکھیں کہ کسی بھی بیمار کی عیادت کوخود اللہ تعالیٰ کی عیادت کے مترادف بتلایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات اگرچہ ہر بیماری سے پاک ہے، اُسے کوئی بیماری وتکلیف ہرگز ہرگز لاحق نہیں ہوسکتی؛ لیکن عیادت کی فضیلت اجاگر کرنے کے لیے اس طرح مثال بیان کی گئی، چناں چہ حدیثِ قدسی میں ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ عزوجل قیامت کے دن فرمائے گا: اے ابن آدم! میں بیمار ہوا اور تو نے میری عیادت نہیں کی۔ وہ کہے گا: اے پروردگار! میں آپ کی عیادت کیسے کرتا، حالاں کہ آپ تو رب العالمین ہے؟ اللہ فرمائے گا کیا تو نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا؟ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا؛ لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا، وہ کہے گا: اے پروردگار: میں آپ کو کیسے کھانا کھلاتا، حالاں کہ آپ تو رب العالمین ہیں؟ تو اللہ تعالی فرمائیں گے: کیا تو نہیں جانتا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا؛ لیکن تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا، کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا، اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا؛ لیکن تو نے مجھے پانی نہیں پلایا؟ وہ کہے گا: اے پروردگار! میں آپ کو کیسے پانی پلاتا، حالاں کہ آپ تو رب العالمین ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا؛ لیکن تو نے اس کو پانی نہیں پلایا، اگر تو اسے پانی پلاتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ (مسلم شریف)

ایک اور روایت میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا: بے شک مسلمان جب اپنے کسی مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو وہ مستقل جنّت کی میوہ خوری میں مصروف رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ عیادت سے واپس آجائے۔ (مسلم شریف) ان کے علاوہ عیادت کے اور بھی متعدد فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ اگر ہم اس کا اہتمام کریں گے تو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہماری بھی حفاظت فرمائیں گے اور زندگی میں چین وسکون کی دولت عطا ہوگی۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر   خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

۞۞۞

قدیم روایتوں کے امین

حضرت مولانا قاری سُرور احمد صاحب قاسمی دیوبندیؒ

محمد فیصل عثمانی دیوبندی

گرامی قدر استاذ محترم مولانا سرور احمد صاحب قاسمی دیوبندیؒ استاذ دارالعلوم دیوبند اڑسٹھ سال کی عمر میں ایک طویل بیماری کے بعد خاندان، احباب اور تلامذہ کو چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے، اناللہ واناالیہ راجعون۔مولانا موصوف کا تعلق دیوبند کے ایک علمی گھرانے سے تھا۔انہوں نے اپنے بزرگوں کی روایتوں کو زندہ رکھا، مال وزر وستی شہرت کیلئے وقت اور حالات سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، مولانا ممدوح نہایت سنجیدہ متین، بردبار، یکسو قسم کے شریف الطبع انسان تھے ان کے چلے جانے سے فکر وعمل، سادگی و دیانت داری کا ایک دیا ہمیشہ کیلئے بجھ گیا۔

مزا جب تھا کہ خود سنتے وہ مجھ سے داستاں میری
کہاں سے لائے گا قاصد! دہن میرا، زباں میری

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں ان کے آباء واجداد کی بڑی اہم خدمات ہیں یہاں تفصیل بیان کرنے کا موقعہ نہیں ہے، مولاناؒ کا مختصر تعارف یہ ہے کہ ان کے پڑدادا حضرت مولانا منظور احمد عثمانیؒ اسلاف دیوبند کی سادگی وللّٰہیت کی یادگار تھے، وہ دارالعلوم دیوبند میں شعبہ فارسی وریاضی کے کامیاب مدرس اور مربی تھے، ان کے تلامذہ کی ایک بڑی تعداد ہے جن میں خاص طور پر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، فقیہ النفس مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ، مفکر ملّت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ، شیخ الحدیث مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ، دیوبند کے اوّلین کاتب مولانا منشی محمد اطہر عثمانیؒ وغیرہ اپنے میدان کی ممتاز ومعروف شخصیتیں شامل ہیں۔مولانا منظور احمد عثمانیؒ کے برادر اکبر مولانا محمد یٰسین صاحب عثمانیؒ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد، حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ مجاز، حضرت تھانویؒ کے ہم سبق، دارالعلوم دیوبند میں شعبہ فارسی وریاضی وعربی کے بڑے مشہور استاد اور مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ کے والد

محترم تھے۔مولانا منظور احمد عثمانیؒ کے فرزند حضرت مولانا ظہور احمد عثمانیؒ ،علامہ کشمیریؒ کے تلمیذ رشید اور دارالعلوم دیوبند میں نامور استاد، حدیث وتفسیر کے ساتھ جملہ علوم وفنون میں زبردست مہارت رکھتے تھے، درس وتدریس ساری زندگی ان کا اوڑھنا بچھونا رہی ،ان کے نامور اور قابل ترین تلامذہ سامنے آئے جنہوں نے علم دین کی بڑی تاریخی خدمات انجام دیں۔

مولانا ظہور احمد صاحبؒ کے بڑے صاحبزادے (مولانا سرور صاحبؒ کے والد) مولانا شکور احمد صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ کتابت کے استاذ تھے اور دیوبند کے بہترین کاتبوں میں ان کا شمار تھا،میرے والد محترم جناب منشی محمد انور کاتب دیوبندیؒ سے ان کے گہرے تعلقات تھے،نشست وبرخاست اور گفتگو میں بڑی بے تکلفی بھی تھی، کتب خانہ رحیمیہ دیوبند کی بعض کتابوں کی کتابت میں وہ والد صاحب کے ساتھ شریک رہے،مولانا شکور احمد صاحب کتب خانہ نعیمیہ دیوبند کے بانی جناب خواجہ محمد بلال صدیقیؒ کے ہم زلف تھے،مولانا ظہور احمد صاحبؒ کے دوسرے فرزند حضرت مولانا خورشید عالم صاحب دیوبندیؒ کا حضرت مدنیؒ،حضرت شیخ الادبؒ ،علامہ بلیاویؒ کے اخص تلامذہ میں شمار تھا، وہ دارالعلوم دیوبند میں تفسیر وحدیث کے بڑے کامیاب مدرس تھے،انہیں مختلف علوم وفنون پر یکساں قدرت حاصل تھی، درس نظامی کی مشکل ترین کتابوں کو چٹکیوں میں حل کرنے والے مولانا خورشید عالم صاحبؒ قضیہ نامرضیہ کے بعد دارالعلوم وقف دیوبند سے وابستہ ہوگئے جہاں وہ شیخ الحدیث ،صدر مفتی ،نائب مہتمم جیسے اہم عہدوں پر فائز تھے۔

مولانا شکور احمد صاحبؒ کے بڑے فرزند مولانا سرور احمد صاحب قاسمی استاد دارالعلوم دیوبند تھے جن کا اجمالی تذکرہ پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا کی پیدائش اپنے آبائی مکان محلہ بڑے بھائیان میں ۳/ مارچ ۱۹۵۱ء کو ہوئی، ابتداء سے انتہاء تک کے تعلیم دارالعلوم دیوبند میں اپنے وقت کے نامور اساتذہ سے حاصل کی۔انہوں نے شعبۂ حفظ میں قرآن کریم جناب قاری محمد کامل صاحب مرحوم ،جناب قاری عتیق الرحمن صاحب کے پاس مکمل کیا۔حفظ میں ان کے رفیق درس مولانا قاری محمد رفعت صاحب قاسمی زیدمجدہم بھی تھے پھر حفظ سے شعبۂ فارسی میں منتقل ہوئے جہاں انہوں نے مولانا ظہیر احمد صاحب جھنجھانویؒ،مولانا رحم الٰہی صاحبؒ،مولانا مشفع حسین دیوبندیؒ،مولانا شمیم احمد دیوبندیؒ،مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی کے حلقۂ تلمذ میں رہ کر فارسی کا نصاب مکمل کیا، پھر شعبہ عربی میں قدم رکھا، یہاں عربی اوّل سے دورۂ حدیث شریف کی تعلیم اپنے وقت کے جید الاستعداد اساتذہ سے حاصل کی ،اس وقت دارالعلوم دیوبند کی مسند تدریس پر امام العصر

حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیریؒ کے نامور تلامذہ جلوہ افروز تھے، جن سے بھرپور علمی استفادے کا موقع ہاتھ آیا۔ صحیح البخاری جلد اوّل شیخ الحدیث حضرت مولانا شریف الحسن صاحب دیوبندیؒ سے پڑھی اور کچھ حصّہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ سے پڑھا۔ جلد ثانی فقیہ الامّت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ سے پڑھی، مسلم شریف دونوں جلدیں حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندیؒ سے پڑھیں، ابوداؤد شریف حضرت مولانا حسین صاحب ملّا بہاریؒ سے، نسائی شریف ومشکوٰۃ المصابیح جلد ثانی حضرت مولانا محمد نعیم صاحب دیوبندیؒ سے پڑھیں، طحاوی شریف حضرت مولانا نصیر احمد خاں بلندشہری سے، ابن ماجہ حضرت مولانا سیّد محمد انظر شاہ کشمیریؒ سے، مؤطا امام محمدؒ ومشکوٰۃ المصابیح جلد اوّل حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ سے پڑھیں، مؤطا امام مالکؒ حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ سے پڑھی، ہدایۂ آخرین حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ دیوبندی سے اور ہدایہ اوّلین حضرت مولانا سیّد اختر حسین میاں صاحب دیوبندیؒ سے پڑھیں۔ تفسیر بیضاوی حضرت مولانا سیّد فخر الحسن صاحب مرادآبادی سے پڑھی، نفحۃ العرب حضرت مولانا زبیر احمد صاحب دیوبندیؒ سے پڑھیں۔ ۱۹۷۳ء میں مولانا نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔

مولاناؒ کے درسی رفقاء میں مولانا ندیم الواجدی صاحب (مدیر ماہ نامہ ترجمان دیوبند)، مولانا حسن الہاشمی صاحب (مدیر ماہ نامہ طلسماتی دنیا دیوبند)، مولانا مفتی محمد امین صاحب پالنپوری، مولانا انعام الٰہی صدیقی، مولانا مفتی محمود حسن بلندشہری، مولانا سہیل عزیز عثمانی، ڈاکٹر محمد نعمان قاسمی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ فراغت کے اگلے سال ۱۹۷۴ء میں مولانا کے والد محترم مولانا شکور احمد صاحب کا وصال ہوگیا اور گھر کی تمام ذمہ داریاں مرحوم پر آگئیں اس وقت ان کے معاشی حالات بھی ایسے مستحکم نہیں تھے کہ فوری طور پر قابو پایا جاسکے، مولانا خود بھی ملازمت کی تلاش میں تھے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے دورِ اہتمام میں مولانا کے عم محترم حضرت مولانا خورشید عالم صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں تفسیر وحدیث کے مایۂ ناز استاذ اور نائب ناظم تعلیمات تھے، ان دنوں شعبۂ حفظ کے ایک مشہور استاد جناب قاری بشیر الحق صاحبؒ کا انتقال ہوگیا تو اس خالی جگہ پر شعبۂ حفظ میں بحیثیت مدرس مولانا کا انتخاب عمل میں آیا کچھ دنوں کے بعد انتظامیہ نے انہیں شعبہ حفظ سے شعبہ اردو دینیات اور فارسی میں منتقل کردیا اور بعد میں تقرر بھی عمل میں آیا۔ اس شعبہ میں مولانا ۱۹۷۷ء سے ۲۰۱۹ء تک تقریباً ۴۵/ سال تک بڑی کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ منصب تدریس پر جلوہ افروز رہے، مولانا افضال الٰہی صاحب عثمانی رفیق کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کی صاحبزادی سے مولانا کا عقد ہوا، جن سے تین بچے تولد ہوئے ایک صاحبزادے مولانا مفتی محمد نوید صاحب

قاسمی استاذ حدیث وافتاء جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند اور دو صاحبزادیاں، الحمدللہ سب صاحب اولاد ہیں۔ مولاناؒ کی خوش دامن شیخ الہندؒ کے بھتیجے مولانا راشد حسن عثمانیؒ کی صاحبزادی تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں والد صاحب دارالعلوم دیوبند داخلے کے لئے لے گئے تو پہلی مرتبہ شیخ التفسیر مولانا سیّد فخر الحسن صاحب مرادآبادیؒ کے فرزند جناب مولانا سیّد نور الحسن صاحبؒ کی درسگاہ میں بٹھادیا گیا، درسگاہ کے عین سامنے زینے کے اوپر والی درسگاہ سے ایک صاحب، دراز قد، خوبصورت، معتدل جسم، ذرا ادھیڑ سی عمر کے آتے جاتے دکھائی دیتے تھے، کئی مہینوں کے بعد معلوم ہوا یہ ''مولانا سرور احمد قاسمی ہیں'' جو ابتدائی بچوں کو پڑھاتے ہیں، جب باقاعدہ داخلہ ہوگیا اور اسباق شروع ہوئے تو مولاناؒ کے گھنٹے میں بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، میں نے مولانا موصوف سے اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھی ہیں دورانِ درس وہ نہایت سنجیدہ رہتے تھے سمجھانے کا انداز بھی نرالا تھا۔ وہ طلبہ کی نفسیاتی طبیعت سے بھی واقف تھے کہ کس بچے کو کس طرح تعلیم کی طرف متوجہ کرنا ہے تمام طلبہ پر ان کی نگاہیں مرکوز رہتی تھیں، کبھی سبق کے دوران کسی غلطی پر انہیں غصّہ آتا تو بڑے سخت ہوجاتے، پھر ہماری خیر نہیں ہوتی تھی تپائی کے نیچے قمچی رکھی رہتی تھی (جسے عام طور پر تنبیہ الغافلین بھی کہا جاتا ہے اس سے شرارت کرنے والوں کی خوب خبر لیتے۔) صبح میں چار گھنٹے تعلیم ہوتی ہے اس درمیان کچھ اساتذہ چائے وغیرہ نوش فرماتے تھے، مولانا عقیل احمد صاحب دیوبندیؒ کی نشست گاہ پر مختصر سا ناشتہ ہوتا تھا جس میں مولانا عقیل احمد صاحب، مولانا نور الحسن صاحبؒ، مولانا سرور احمد صاحب مرحوم، مولانا سہیل عزیز عثمانی شریک ہوتے، کبھی کبھار مولانا محمد خالد رامپوریؒ بھی تشریف لاتے تھے ناشتہ لانے کی ذمہ داری کبھی میری کبھی دوسرے طالب علم کی ہوتی، اس دوران ان حضرات کی مختلف موضوعات پر گفتگو بھی چلتی رہتی اور پُرمزاح باتیں بھی، ہمارے بہت سے اساتذہ وفات پاچکے ہیں بعض حیات ہیں اللہ تعالیٰ ان کا سایہ دیر تک قائم رکھے آمین۔ حضرت امام ابوداؤد سلیمان اشعث سجستانیؒ (وفات ۲۷۵ھ) کی معروف زمانہ کتاب سنن ابوداؤد شریف کے ترجمے کا آغاز مولانا نے اپنے عم محترم کی نگرانی میں کیا۔ انہوں نے بڑی تحقیق وجستجو اور کثرت مطالعہ کے ساتھ عالمانہ انداز میں ترجمہ ومختصر شرح سنن ابوداؤد کے نام سے دو جلدیں تیار کیں۔ اس ترجمہ پر شیخ الحدیث حضرت مولانا خورشید عالم صاحب نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند نے اپنی مصروفیات کے باوجود نظر ثانی فرمائی اور ضروری مشورے بھی دیئے، یہ ترجمہ ہندوپاک سے شائع ہورہا ہے، مولانا کی ایک کتاب اور نماز سے متعلق مسائل سجدہ سہو، مکتبہ ہدایت دیوبند سے طبع ہوچکے ہیں، مولانا کی بعض تالیفات مسودے کی شکل میں ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔

مولانا کی زندگی صبر وتقویٰ اور قناعت سے لبریز تھی انہوں نے کبھی ذاتی مفاد کیلئے کسی کے سامنے دامن

نہیں پھیلایا، جوملا جتنا ملا اُسے خوش دلی کے ساتھ قبول کیا، وہ صحیح معنیٰ میں ان اللہ مع الصابرین کی عملی زندگی کا ایک نمونہ تھے، وفات والے دن بروز پیر ۴/نومبر ۲۰۱۹ء کو دارالعلوم سے پڑھا کر گھر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں کے بعد وہ سفر آخرت پر روانہ ہوگئے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔آمین

دارالعلوم دیوبند کے احاطہ مولسری میں بعد نماز عشاء حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی کی اقتداء میں نماز جنازہ ادا ہوئی جس میں اساتذہ،طلبہ، خاندان اور شہر کی ملی وسماجی سرکردہ شخصیات نے شرکت کی اور مزارِ قاسمی جو اکابر دیوبند کی آخری آرام گاہ ہے وہاں تدفین عمل میں آئی۔ تمام حضرات سے گزارش ہے کہ مولانا مرحوم کو دعائے مغفرت میں یاد رکھیں۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

۞۞۞

حضرت حکیم الامت اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ مجھ کو علماء کا یہ طرز ناپسند ہے کہ وہ سائل کے ہر سوال کے جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں، جواب دینے کے بھی تو کچھ شرائط ہیں، آخر نماز اتنا بڑا رکن ہے دین کا، مگر وہ بھی قیود اور شرائط سے خالی نہیں، ان شرائط کا حاصل یہ ہے کہ اول ہی دیکھ لینا چاہئے کہ وہ سوال ضروری ہے یا غیر ضروری، پھر اگر یہ بھی معلوم ہوجائے کہ فی نفسہ ضروری ہے تو پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ مشغلہ کے طور پر سوال کررہا ہے یا واقع میں بھی اس کی ضرورت ہے، اگر محض مشغلہ مقصود ہے اور عمل وغیرہ مقصود نہیں تو ایسے شخص کو ہرگز نہ جواب دیا جائے، البتہ علم کا جو حصہ فرض عین ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہے، غرض اس قسم کی باتوں کا خیال رکھنا علماء کو بہت ضروری ہے۔

علماء نے جو ان اصول کو چھوڑ دیا، اس سے بہت مخلوق فضول میں مبتلا ہوگئی، یہی وجہ ہے کہ عوام الناس، جاہل تک علماء کو اپنا تختۂ مشق بنا لیتے ہیں اور مسائل دینیہ میں اپنے منصب کے خلاف دخل دیتے ہیں اور بلا ضرورت خواہ مخواہ علماء کو پریشان کرتے اور جھگڑوں میں پھنساتے ہیں اور علماء کے ایسا کرنے کا سبب اکثر جاہ ہے کہ جواب دینے سے زیادہ معتقد ہوجائے گا یا اور اغراض فاسدہ ہیں مثلاً یہ کہ ہم کو بدنام کریں گے یا اپنے دل میں سمجھیں گے کہ انہیں کچھ آتا جاتا نہیں یا مدرسہ کا چندہ بند کردیں گے، اس لئے ہر سوال کا جواب دینے کو تیار ہوتے ہیں، سو یہ بھی اچھی خاصی مصیبت ہے۔

معلوم بھی ہے کہ بڑے سے بڑے عالم، محقق، امام اور مجتہد کو بھی بعض مسائل پر لا ادری (مجھے معلوم نہیں) کہنے کے سوا کچھ نہیں بن پڑا۔ خلاصہ یہ ہے کہ علماء کو مسائل کا تابع نہ ہونا چاہئے بلکہ سائل کو اپنا تابع بنانا چاہئے، ہاں جہاں سوال ضروری ہو اور طالب کو بھی فی الحقیقت ضرورت ہو، وہاں اپنے اور کاموں کو چھوڑ کر بھی جواب دینا چاہئے، اس لئے کہ وہاں دین کی ضرورت ہے۔(ملفوظات حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ج5 ص32)

گوشۂ رشیدؒ

جامعہ کے روحِ رواں اور مستند عالم دین، ذہین وفطین، باوقار ومتین، حضرت مولانا عبدالرشید بستوی کی وفات پر ایک سال ایک لمحے کی طرح گذر گیا، وہ جامعہ کے صحن میں بادِ بہاری کا ایک خوشگوار جھونکا بن کر آئے اور اسی برق رفتاری کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہوئے فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝ گذر گئے۔ مولاناؒ کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع اور ہمہ جہت ہے، جس کے پیش نظر محدث عصر ماہ بماہ ''گوشۂ رشید'' کے عنوان کے تحت مولانا کے قدرداں، اہل علم، اساتذہ، تلامذہ اور معاصرین و متعلقین کے مولانا سے متعلق تأثرات ومضامین شائع کررہا ہے، اس سلسلے کی دوسری کڑی قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

حضرت مولانا عبدالرشید بستویؒ
شخصیت کے چند پہلو

مولانا فضیل احمد ناصری
استاذ حدیث ونائبِ ناظمِ تعلیمات جامعہ ہٰذا

رجلِ رشید کی رحلت

بالآخر ہمارے درمیان سے وہ شخص بھی اٹھ گیا جس کے اٹھ جانے کا کسی کو کوئی وہم وگمان بھی نہ تھا۔ جامعہ کے استاذِ حدیث اور نہایت مؤقر عالمِ دین حضرت مولانا عبدالرشید بستوی بھی مسافرانِ آخرت میں شامل ہوگئے۔ یہ حادثہ اچانک رونما ہوا اور اتنا اچانک کہ کسی کو بھی ابھی تک ان کی وفات کا یقین نہیں ہے۔ کشیدہ قامت، بسطۃً فی العلم والجسم کا مصداق۔ خوب صورت چہرہ، تبسم ریز لب اور وقار وتمکنت کی یہ مجسم تصویر اب ہمارے درمیان نہیں رہی۔ ۲۵/اکتوبر بروز جمعرات علی الصباح چار بجے ان کی طبیعت جو بگڑی تو بگڑتی ہی چلی گئی۔ درمیان میں افاقہ ہوا بھی، تو بجھتے ہوئے چراغ جیسا، جو تیز لووں کے ساتھ خاموش ہوجاتا ہے۔ دوپہر میں چند اساتذہ ایک جگہ اکٹھے تھے، باتوں باتوں میں ماضی کی داستان چھڑی ہوئی تھی، زیرِلب تبسم بھی تھا اور زوردار قہقہے بھی، قصۂ پارینہ کے ساتھ مولانا کا ذکرِ جمیل بھی جاری تھا۔ ہم یہ سمجھے کہ ان کا نام بس یوں ہی برسبیل تذکرہ آگیا ہے، مگر کیا معلوم تھا کہ پردے میں کرب کا کوئی طوفان بھی پنہاں ہے۔ مولانا بیمار تھے، مگر اتنے بھی نہیں کہ اچانک بزمِ عالم سے برخاست ہوجائیں۔ یہ خدشہ تو ہرگز نہیں تھا۔ معاملہ کوئی سنگین نوعیت کا بھی نہ تھا، تاہم ان کی گرتی صحت اساتذہ کے درمیان فکرمندی کا باعث

ضرور تھی، لیکن شام ہوتے ہوتے جو وحشت ناک خبر سامنے آئی اس نے تو پورے وجود کو ہی ہلا کر رکھ دیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔مولانا کی وفات سے طبیعت پر اب تک اثر ہے اور تیز چلنے والا قلم اب چلنے کا نام نہیں لے رہا۔ ہر وقت ان کا چہرہ نگاہوں کے سامنے ہے اور ان کی زندگی دل کے نہاں خانے میں۔

مولانا سے میری پہلی ملاقات

مولانا سے میری ملاقات پہلے بھی ہو چکی تھی، تاہم تعارف نہیں تھا۔تعارف وشناسائی کی نوبت بطور مدرس میری دیوبند آمد کے بعد ہی آئی۔ میں ۲۰۰۸ء میں دیوبند آیا۔ رفتہ رفتہ یہ ملاقات رفاقت میں بدلی اور پھر کم وبیش دس برسوں تک یہ رفاقت جاری رہی۔ جب میں اہل وعیال سمیت دیوبند آیا تو میری رہائش اسی مکان میں ہوئی جس میں مولانا اپنے بچوں کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ وہیں سے مراسم روز بروز بڑھتے اور پروان چڑھتے چلے گئے اور الحمدللہ یہ تعلقات قائم رہے، بالخصوص زنانِ خانہ کی باہمی راہ ورسم سدابہار ہیں۔ یہاں رہتے ہوئے مولانا کو قریب سے دیکھنے سننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ان کی ہمہ جہت اور قابل رشک پہلوؤں کو پرکھنے کے مواقع میسر آئے۔

مولانا کی وجہِ تسمیہ

مولانا مرحوم ۱۹۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام حاجی گل محمد اور دادا کا نام محمد دولت ہے۔ ان کے والد الحمدللہ حیات ہیں اور پچاسی کے آس پاس ان کی عمر ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ میرے خاندان میں کوئی بھی عالم نہیں تھا۔ ۱۹۶۲ء کا دورانیہ تھا اور اپنے گاؤں کھمریا، بستی میں مقیم۔دفعتاً خیال آیا ایک جگہ رہتے رہتے طبیعت کچھ اکتا سی گئی ہے، کیوں نہ دلی گھوم کر دل بہلا لیا جائے، چنانچہ دہلی آئے اور کسی پر بوجھ بننے سے بچنے کے لیے انہوں نے کہیں کام دھندا شروع کر دیا۔ یہ وہ دور تھا، جس میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ اور حضرت مولانا ابوالوفا شاہ جہاں پوریؒ کی خطابت سے پورا ملک گونج رہا تھا۔ان کے بیانات دہلی میں ہوتے تو حاجی صاحب ان میں ضرور شرکت کرتے۔ یہیں سے ان کے دل میں اہل اللہ سے محبت پر شباب چڑھا۔ بتاتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے ساتھ ایک بڑا حادثہ ہوا، جس میں الحمدللہ میں تو خیر بال بال بچ گیا، مگر میرے چار ساتھی حادثے کی نذر ہو گئے۔ وہ کمرے میں تھے کہ گیس کی ٹنکی اچانک پھٹ گئی اور زوردار آوازوں سے پورا محلہ گونج گیا۔ چار میں سے دو ساتھی تو موقع پر ہی شہید ہو گئے، جب کہ ایک ساتھی اپنی ٹانگیں گنوا بیٹھا اور چوتھا بھی زخموں کی تاب نہ لا کر دو چار دن بعد قضا کر گیا۔ میں اس وقت قضائے حاجت کے لئے گیا تھا اور اس طرح میری جان بچ گئی۔ان ساتھیوں میں سے

ایک گنگوہ کا تھا، وہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے حالات بڑے اہتمام سے سنایا کرتا۔ان کے حالات سن سن کر جی بہت مچلتا اور ان کے مزار پر حاضری کی خواہشیں انگڑائیاں لیتی رہتیں۔ کیونکہ میں نے ان خطیبوں سے سن رکھا تھا کہ اولیاء اللہ کے مزار پر حاضری بھی اصلاح قلب میں بڑی مؤثر ہوتی ہے۔موقع پا کر ایک دفعہ گنگوہ والے ساتھی کی قیادت میں بس بھر کر گنگوہ جا پہنچا۔میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔فقیہ النفس حضرت گنگوہیؒ کے کے مزار پر حاضری دی۔میں نے ان کے وسیلے سے بارگاہِ خداوندی میں یہی دعا کی کہ اے اللہ! آئندہ مجھے بھی ایسی ہی باکمال اولاد عطا فرما! الحمدللہ دعا قبول ہوئی۔اور جب میرا یہ بچہ پیدا ہوا تو میں نے اس کا نام انہی کے نام پر رشید احمد رکھا۔ مجھے بڑی خواہش تھی کہ میں اسے دینی تعلیم دلاؤں، چناں چہ میں نے شروع سے ہی اسی لائن میں رکھا اور اس کی تعلیم پر پوری طرح توجہ دی۔

ابتدائی تعلیم

مولانا کی تعلیمی زندگی کا آغاز ان کے گاؤں کھمریا کے مدرسہ سراج العلوم نامی مکتب سے ہوا۔عربی تعلیم کے لیے مدرسہ انوار العلوم مہوا بسم اللہ خاں میں داخلہ کرایا گیا۔ یہ علاقہ پہلے گونڈہ میں واقع تھا اور اب بلرام پور میں ہے۔ وہاں انہوں نے عربی چہارم تک پڑھا، اسی سال وسط میں مدرسہ انتشار کا ہوا تو وہاں سے چلے آئے۔کسی نئے ادارے کی تلاش تھی ،مگر درمیانی سال کے سبب کہیں داخلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ گاؤں کے کچھ لڑکے مدرسہ شاہی مرادآباد میں زیر تعلیم تھے۔وہ چھٹی پر آئے تھے۔وہی باصرار اپنے ساتھ مدرسہ شاہی لے گئے اور وہاں داخلہ ہو گیا۔مولانا بڑے ذہین تھے۔ اور یہ ذہانت بچپن سے ہی اپنی کرامات کے ساتھ جلوہ بار۔ان کے درسی ساتھی حضرت مولانا عبدالحمید نعمانی صاحب بتاتے ہیں کہ سلم العلوم کا امتحان مولانا عبدالوہاب صاحب کے پاس گیا۔ میں اپنی جماعت کا ممتاز طالب علم تھا۔ہم دونوں نے شاندار جواب دیا۔مولانا عبدالوہاب صاحب حیران تھے کہ کیا نمبر دیا جائے، چناں چہ دونوں کو ۵۱-۵۱ نمبرات دیے، جب کہ وہاں سب سے زیادہ نمبر پچاس تھا۔

دارالعلوم دیوبند میں

مولانا نے یہاں پنجم اور ششم پڑھا اور پھر دارالعلوم دیوبند آ گئے۔دارالعلوم دیوبند میں مولانا کا قیام تین سال رہا، درس اثنا ہفتم اور دورہ پڑھا اور ۱۹۸۶ء میں فراغت پائی۔ایک سال انہوں نے تکمیل ادب میں بھی لگایا۔ یہ وہ دور تھا جب حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مردم سازی اور آدم آفرینی کی ہر جگہ طوطی بول رہی تھی۔ان کی علمی و ادبی خدمات کا ڈنکا بج رہا تھا۔مولانا مرحوم کی ہم نصیبی کہ

انہیں حضرت کیرانویؒ جیسی شخصیت کی آغوش تربیت ملی۔ حضرت کیرانویؒ نے اپنی خداداد صلاحیت اور آدم گری کی بے نظیر استعداد سے انہیں مانجھا اور عربی زبان وادب کا ان میں مذاق بھر دیا۔

عملی میدان میں قدم زنی

ادب عربی ۸۶-۱۹۸۷ء میں کرلی تو مولانا نے عملی میدان میں قدم رکھا، استعداد کامل ہو، ہمت بلند ہو اور نظر عمیق ہو تو پرواز بھی فلک پیما ہوتی ہے، مولانا نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز اپنے وطن کے ادارے دارالعلوم اسلامیہ شہر بستی سے کیا، یہ ادارہ مردم گری اور صلاحیت سازی میں ہمیشہ مشہور رہا ہے، مولانا مرحوم نے اپنی جدوجہد سے یہاں بڑا فیض پہنچایا، اسلامیہ میں ان سے شرف تلمذ پانے والے ان کی تدریس کا بڑا ذکر کرتے ہیں، وہاں سے نکلے تو کولہا پور مہاراشٹر کی زمین انہیں لے اڑی، یہاں مدرسہ قاسم العلوم، قصبہ چندگڑھ میں اپنی مسند سنبھال لی، یہاں ان کا قیام زیادہ طول نہ پکڑ سکا، اب جامعۃ القرآن الکریم، جھنڈا پور ضلع بجنور نے یاد کیا، یہاں بھی ان کی خدمات زیادہ دیر جاری نہ رہیں، پھر وہ وقت آیا کہ مرکز المعارف آسام کی دیوبند شاخ سے منسلک ہوگئے، اور یہاں سے دارالعلوم کی شیخ الہند اکیڈمی سے وابستگی ہوئی، پھر وہ وقت آیا کہ دارالعلوم میں تدریس کے لئے منتخب کرلیا گیا، دارالعلوم سے علیحدگی ہوئی اور جامعہ امام محمد انور شاہ سے منسلک ہوئے تو چند گھنٹے دارالعلوم وقف میں بھی دیئے گئے، اس طرح دیوبند کے تین بڑے اداروں میں انہیں اپنی تدریسی خدمات سے نونہالانِ امت کی تعلیم وتربیت کے بہترین مواقع ملے۔

اکیڈمیوں میں مولانا کی خدمات

مولانا نے اپنی خدمات کا دائرہ صرف تدریس تک محدود نہیں رکھا، بلکہ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی طالع آزمائی کی، تصنیف وتالیف کے لئے اکیڈمیاں زیادہ موزوں ہوتی ہیں، مولانا نے بھی ان جولان گاہوں میں اپنے اوقات عزیز صرف کئے، مرکز المعارف کی دیوبند شاخ میں برسوں رہے۔ شیخ الہند اکیڈمی میں بھی ان کی خدمات ہیں، ان کے علاوہ دارالمؤلفین دیوبند سے بھی ان کی وابستگی رہی، جامعہ امام محمد انور شاہ میں قائم ''مجمع الانور'' (امام العصر اکیڈمی) سے ان کا تعلق تو تاعمر باقی رہا، دارالعلوم کی شیخ الہند اکیڈمی سے تعلقات کے دوران ان کی تعلیقات وتحشیہ سے کئی کتابیں آئیں، جن میں حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی کی مشہور کتاب ''اشاعت اسلام''، مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی تصنیف ''آئینۂ حقیقت نما''، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ''تقریر دل پذیر'' اور حضرت مولانا عبداللہ بستوی مہاجر مدنیؒ کی ''تذکرۃ النعمان'' بہت معروف ہیں۔

قلمی کاوشیں

تعلیق وتحشیہ کے علاوہ انہوں نے مستقل تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی شروع کیا اور تاحیات اسے جاری رکھا، مولانا جس موضوع پر لکھتے تھے، اس کے اطراف وجوانب اور مالہ وماعلیہ پر پوری نظر رکھتے تھے اور کمزور پہلو سے اعراض کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں کچی باتیں نہیں پائی جاتیں، مولانا کی مستقل تصنیفات کی فہرست حسبِ ذیل ہے:

(۱)عورت اسلام کے سائے میں۔(۲)مذہبی رواداری۔(۳)درسِ حدیث دیگراں، سیرت نبویؐ(۴)علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنی ہشت پہلو شخصیت کے آئینے میں(۵)محاورات وامثال، عربی سے اردو(۶)مسلم ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق۔(۷)خیرالمجالس، مجلس علمی جواہر پارے۔(۸)انسانی حقوق کا اسلامی وعالمی منشور، تقابلی مطالعہ۔

عربی زبان پر مولانا کا عبور

مولانا یوں تو ہرفن مولا تھے، مگر عربی زبان وادب سے ان کی دل چسپی زیادہ تھی، مولانا کا یہ ذوق شیخ الادب حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی بارگاہِ شاگردی میں مزید چمک پا گیا تھا۔ وہ عربی بے تکلف اور برجستہ لکھ لیتے تھے۔ ان کی عربیت کا ہی اثر تھا کہ دارالعلوم دیوبند میں جب بطور مدرس ان کا تقرر ہوا تو درجۂ تکمیلِ ادب عربی میں ان کے گھنٹے لازماً رہے۔ جامعہ امام محمد انور شاہ میں تکمیل ادبِ عربی کا درجہ انہیں کی بناپر شروع ہوا۔ عربی زبان سے حد سے زیادہ لگاؤ نے ان کی علمی قابلیت میں چار چاند لگا دیئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عربی سے اردو اور اردو سے عربی کرنا ان کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ قلم کی لائن سے انہوں نے جتنی کتابیں یادگار چھوڑ دی ہیں، ان میں اکثریت ترجمے کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

ترجمہ بہ زبانِ عربی: (۱) حیاتِ شیخ الہند، از: حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب دیوبندیؒ (۲) خاتم النبیین، از: امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ (۳)نقش حیات، از: حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ (۴)العقل والنقل، از: حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (۵)الاسلام، (ایضًا)(۶)اسلام میں مرتد کی سزا (ایضا)(۷)انسان اور انسانیت، از: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۸)نوادراتِ امام کشمیریؒ، از: حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ۔

ترجمہ بہ زبانِ اردو: رجال السند والہند، از حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ (۲)یتیمۃ البیان، از: حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ (۳)اولیات عمر الفاروق، از: حضرت علامہ جلال الدین

سیوطیؒ (۴) کتاب الفتن ،از: حضرت علامہ نعیم بن حماد مروزی (۵) من ادب الاسلام،از: حضرت علامہ عبدالفتاح ابوغدہ شامیؒ،(۶) فقہ اہل العراق وحدیثھم ،از: حضرت علامہ زاہد الکوثریؒ۔

مولانا کی تعریب کردہ کتابوں کی تعداد ۱۱ر ہے، جب کہ ترجمہ بہ زبانِ اردو کی تعداد ۱۳ر ان کارناموں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو اور عربی زبان ان کے لئے کس قدر سہل واقع ہوئی تھی!!

مولانا بحیثیتِ ناظمِ تعلیمات

مولانا مرحوم میں علمی کمالات کے ساتھ انتظامی قابلیت بھی خوب خوب تھی، جامعہ ہذا جس زمانے میں معہد الانور تھا،اس کی نیک نامیوں کا ایک سبب مولانا مرحوم بھی تھے۔ وہ یہاں دومرتبہ ناظمِ تعلیمات رہے، معہد الانور کے دور میں بھی اور جامعہ ہونے کے بعد بھی۔ بحیثیتِ ناظمِ تعلیمات ان کا پہلا دور آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ دوسرے دور میں بھی ان کی کامیابیاں کافی رہیں،مگر اپنے اعذار کے سبب انہیں زیادہ طول نہ دے سکے۔ مولانا کئی برس صدر المدرسین بھی رہے اور آخر تک یہ منصب انہیں سے منسلک رہا۔

مولانا مرحوم خوبیوں کا مرقع تھے

غرض مولانا ہمہ جہت کمالات سے متصف تھے۔ وہ جتنے شان دار مدرس تھے، اتنے ہی طاقت ور مصنف بھی تھے۔ عربی ادبیات پر ان کی نظر جیسی دقیق اور عمیق تھی، ویسی بہت کم اہلِ علم میں ہوتی ہے۔ تقریر بھی ان کی بڑی رس دار اور کامیاب ہوتی۔ کسی بھی موضوع پر خطاب شروع ہوتا تو آخر تک اس کو نبھاتے۔ منتظم بھی بڑے اچھے تھے۔ ان کی نظامتِ تعلیمات کا دور جامعہ کی سنہری تاریخ کا تابناک دور ہے۔ رسالہ محدثِ عصر سے ان کی وابستگی ہمیشہ رہی۔ ان کی تخلیقات سے رسالہ زینت پاتا۔ ان کے اچانک وصال نے چاہنے والوں کا دل توڑ دیا ہے۔ اللہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

۞۞۞

مولانا عبدالرشید بستویؒ

ایک رجلِ رشید تھے، نہ رہے

مولانا قاری ابوالحسن اعظمی
رکن رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ

تعلقات کی مدت بہت طویل ہے، یہ داستان کہاں سے شروع کی جائے، قلب و دماغ کی حالت تا حال دگرگوں ہے، جب بھی خیال آتا ہے، دل بھر آتا ہے۔

میں دارالعلوم دیوبند میں آچکا تھا، مولانا مرحوم کی آخری تعلیم اور فراغت دارالعلوم ہی سے ہوئی، یہاں دیگر نصابی علوم کی تکمیل کے بعد ادیبِ یگانہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ سے آپ کا خصوصی ربط و ارتباط رہا۔ ساتھ ہی مولانا خلیل الامینی استاذ ادب دارالعلوم سے مربوط رہے، اس لئے ہر دو حضرات سے بطور خاص متاثر رہے اور ادبِ عربی کے بہترین استاذ بن کر ابھرے۔

مولانا عبدالرشید صاحب بستی کے رہنے والے تھے، اس لئے وطن کے ایک بڑے مدرسہ، جامعہ اسلامیہ بستی میں خدماتِ تدریس انجام دینے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرر ہوا۔ مولانا یہاں زیادہ مدت تک تو نہیں رہے مگر جب تک بھی رہے خاص طور پر ادب عربی کے شائقین طلبہ کی نگاہوں کے مرکز رہے۔ آپ سے طلبہ نے خوب خوب استفادہ کیا۔

کیا عرض کروں تدریسِ دارالعلوم کے آغاز ہی سے میرے ساتھ خصوصی اعتناء رہا، روزانہ میری درسگاہ میں اور بھی عربی کے اساتذہ آتے تھے مگر مولانا کا وقت بعد مغرب کا تھا، یہ وقت دونوں کے لئے فراغت کا ہوتا تھا، اکثر بعد مغرب سے عشاء تک درس گاہ میں رہتے اور ہر موضوع سے تعرّض رہتا۔

میرے چند اخص الخصوص احباب و متعلقین میں مولانا سرفہرست تھے، سنجیدہ موضوع پر سنجیدہ گفتگو بھی رہتی اور پرلطف باتیں بھی ہوتیں، شعروشاعری کا ذکروتذکرہ بھی ہوتا، بتا تا چلوں کہ مولانا بڑی خوبصورت آواز کے مالک تھے اور خوش آوازی میرا تو میدان ہی ہے۔

جب مولانا کا دارالعلوم دیوبند سے تعلق منقطع ہوا اور دیوبند سے سروسامان باندھ کر عازمِ وطن ہونے لگے تو بعد مغرب میرے پاس درس گاہ میں تشریف لائے، میں سراپا غم تھا، اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے کہا: ''مولانا! آپ کل صبح جانے سے پہلے ایک بار مجھ سے اور مل لیجئے، اس وقت تو آپ کمرے میں جایئے، میں کہیں جارہا ہوں۔''

میرے پاس میرے ایک ملنے والے بیٹھے ہوئے تھے، ان کے ذریعہ کاغذ کا ایک سطری ٹکڑا حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کشمیری علیہ الرحمہ شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند کی خدمت میں یہ لکھ کر بھیجا کہ ''حضرت والا! مجھے ابھی حاضری کی اجازت مرحمت فرمایئے۔'' حضرت مولانا نے فوراً مجھے طلب فرمالیا، حاضر ہوکر میں نے بلاکسی تمہید کے عرض کیا ''مولانا عبدالرشید صاحب کے بارے میں آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا، میری گذارش ہے کہ آپ انہیں اپنے معہد میں رکھ لیجئے، یہاں سے جانے نہ دیجئے۔''

میرا یہ عرض کرنا تھا کہ حضرت مولانا نے صاحبزادۂ محترم مولانا سید احمد خضر شاہ صاحب مدظلہٗ سے فرمایا ''ارے بھائی خضر! میں مولانا عبدالرشید صاحب کی صلاحیت سے خوب واقف ہوں، ان کی بڑی محنت سے لکھی ہوئی محققانہ کتاب میری نظر سے گذری ہے آپ اُن سے کہہ دیجئے کل صبح معہد میں آجائیں، میں ان کا تقرر کرتا ہوں۔''

حضرت مولانا کو جیسے عظیم الشان دولت حاصل ہوگئی، میری گذارش پر باغ باغ ہوگئے، بعد میں بھی وقتاً فوقتاً دعاؤں کے ساتھ فرمایا کہ ''انہوں نے مجھے ایک بڑا قیمتی دانا دیا ہے۔''

مولانا عبدالرشید صاحبؒ ایسے ہی گوناگوں صلاحیتوں کے حامل تھے۔

ایک کامیاب، عمدہ مدرس، لائق وفائق ادیب، صاحبِ زبان وقلم مقرر اور مصنف تھے۔ مولانا بڑے ہی یکسو، کم گو، فضول باتوں سے دور، اپنے کام سے کام، خاص احباب کے ساتھ نہایت مخلصانہ ربط اور تعلقات کو باقی رکھنے والے، بڑے ہی نیک سیرت عالم باعمل تھے۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ مولانا سے کسی کو کبھی کسی قسم کی اذیت تو دور کی بات ہے، ادنیٰ سی شکایت بھی نہ رہی ہوگی۔

معہد الانور کی تدریس کے بعد آپ کی صلاحیتوں کے اور بھی جوہر کھلے، آپ نے یہاں متعدد ذمہ داریاں نبھائیں، عرصہ تک نظامت تعلیمات پر فائز رہ کر بیش بہا خدمت انجام دی۔ حضرت مولانا کشمیریؒ کے تو آپ معتمدِ خاص تھے ہی، آپ کے بعد صاحبزادۂ محترم مولانا سید احمد خضر شاہ صاحب نے بھی آخر تک آپ پر بھرپور اعتماد کیا۔

انتقال سے تھوڑے ہی دنوں پہلے خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحبؒ پر منعقدہ سیمینار کے لئے مضمون لکھا اور پڑھا، پھر چند ہی روز پہلے ترکیسر کے سیمینار کے لئے جو مولانا عبداللہ صاحب کاپودرویؒ پر منعقد ہوا تھا مقالہ لکھا اور ہمارے ساتھ شریک ہوئے۔ واپسی جہاز سے ہوئی تو دہلی ایئرپورٹ پر ساتھ رہے۔ مجھے ایک دوسری جگہ جانا تھا، سلام ومصافحہ کے بعد مولانا نے اپنی اسی سابقہ دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔ آہ! کیا خبر تھی کہ یہ ہماری آخری ملاقات اور آخری مصافحہ ہوگا۔

مولانا کا وقتِ موعود آگیا تھا، چلے گئے لیکن یہ واقعہ ہے کہ بہتوں کو روتا بلکتا ہوا رنجیدہ چھوڑ گئے۔ آپ کے مخلصین واحباب کی بڑی قیمتی اور پرکشش صحبت لٹ گئی، آپ آج بھی ہنوز روزِ اوّل کی طرح یاد آتے ہیں اور پھر ایک پرسوز آہ نکل جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایسی متنوع صلاحیتوں کے جامع حضرات کم ہی پیدا ہوتے ہیں، اسی لئے جب رخصت ہوجاتے ہیں تو بڑا بھاری خلا چھوڑ جاتے ہیں۔

مولانا! آپ تو چلے گئے، مگر بڑی یادیں چھوڑ گئے، بلاشبہ اب ایسے مخلص نہیں ملیں گے۔ آہ! فآہ! ثم آہ!!

اللہ رب العزت بال بال مغفرت فرمائے، درجاتِ عالیہ سے نوازے۔ آمین

۞۞۞

حضرت مولانا عبد الرشیدؒ کی زندگی کے چند تابندہ نقوش

محمد سلیمان اختر فاروقی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر شیئ اس دنیا میں متعین مدت تک کے لیے وجود میں آتی ہے، اور اپنی متعین مدت کی تکمیل کے بعد فنا ہوجاتی ہے، صرف اللہ پاک کی ذات ہی باقی رہنے والی ہے، جان داروں اور بے جان اشیاء میں فنا کی صورتیں مختلف ہیں، بے جان اشیاء کی نفس ہلاکت ہی فنا سے عبارت ہوتی ہے، البتہ جانداروں کے تعلق سے فنا کے لیے موت سے دو چار ہونا ضروری ہے، چناں چہ قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ط ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے، یعنی جو بھی مخلوق اس دنیا میں پیدا ہوئی ہے یا ہوگی، اسے اپنی حیات مستعار کی میعاد پوری کر کے موت سے دو چار ہونا ہے، موت کے بعد کی زندگی کے تعلق سے ہر مخلوق کا معاملہ جداگانہ ہے، انسان اور جن کے علاوہ دوسری مخلوقات چوں کہ مکلف نہیں ہیں اس لیے ان کے لیے بعث بعد الموت اور بعد ازاں جنت اور دوزخ کا فیصلہ ناممکن ہے، البتہ اگر کوئی غیر مکلف مخلوق دنیا میں ظلم سے دوچار ہوئی ہے تو آخرت میں اس کو انصاف دلانے کی غرض سے دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کر کے اس کا وجود ختم کر دیا جائے گا، لیکن انسان اور جن کے ساتھ حشر ونشر اور جنت و دوزخ کے معاملات وابستہ ہیں۔

دنیا میں اس کی تمام تر وسعتوں اور اس میں بے شمار انسانوں کی تخلیق کے سبب کوئی ایسا دن نہیں گزرتا ہے جس دن کسی انسان کی موت یا پیدائش نہ ہوتی ہو، ہر آن اور ہر لمحہ اموات کا سلسلہ جاری ہے، کوئی تو اپنی طبعی موت مرتا ہے، تو کوئی کسی حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے چلا جاتا ہے، کوئی جوانی میں ہی داغ مفارقت دے جاتا ہے، تو کوئی بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ کر موت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ کسی کے حق میں دنیا کی بہاریں مقدر ہی نہیں ہوتی ہیں تو وہ بچپن ہی میں اللہ کی طرف سدھار جاتا ہے، غرضیکہ موت ایک ایسی سچائی ہے جس کا سامنا بڑے، بوڑھے، بچے اور جوان، امیر وغریب، بادشاہ اور رعایا، میں سے، ہر ایک ہوتا ہے اور وہ دنیا سے آخرت کی طرف کوچ کر کے دنیا کی تمام رعنائیوں اور چمک دمک سے آنکھیں بند کر کے اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوجاتا ہے؛ لیکن چند شخصیات ایسی بھی ہوتی

ہیں جن کا عالم بالا کی طرف انتقال نہ صرف ایک کنبہ، خاندان، گاؤں اور محلہ بلکہ پورے عالم کے لیے خسارے کا باعث ہوتا ہے، جس کی کمی کی تلافی بمشکل ہو پاتی ہے، انہیں شخصیات میں ایک مایۂ ناز شخصیت حضرت الاستاذ مولانا عبدالرشید صاحب رحمہ اللہ کی ہے، آپ مورخہ ۱۶/اکتوبر ۲۰۱۸ء کو عالم فانی سے عالم بالا کی طرف سدھار گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کے سانحۂ ارتحال کی خبران لوگوں کے لیے کسی بھی قیامت صغریٰ سے کم نہ تھی جنھوں نے کبھی بھی آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہو یا غیر رسمی طور پر ہی سہی کچھ سیکھا ہو۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ ۱۹۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام حاجی گل محمد اور دادا کا نام محمد دولت ہے۔ آپ سے قبل آپ کے خاندان میں کوئی بھی عالم نہیں تھا، البتہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دین داری ضرور تھی، اور دل میں اس بات کی کسک بھی تھی کہ آپ کے یہاں بھی کوئی عالم پیدا ہو، شاید یہی وجہ ہے کہ مستقبل میں آنے والے واقعات آپ کے عالم بننے کا سبب بن گئے، چناں چہ آپ کے والد کا ایک بار دہلی کا سفر ہوا، اس وقت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ اور حضرت مولانا ابوالوفا شاہ جہاں پوریؒ کی خطابت کی صدائے بازگشت پورے ہندوستان میں سنائی دے رہی تھی، جب بھی ان کے بیانات دہلی میں ہوتے تو آپ ان میں ضرور شریک ہوتے۔ یہیں سے آپ کے دل میں اہل اللہ بالخصوص اکابر دیوبند کی محبت گھر کرنے لگی، خاص طور سے حضرت گنگوہیؒ سے تو بے حد عقیدت اور محبت پیدا ہوگئی، اس کی وجہ بعض حضرات یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ کا ایک ساتھی جو گنگوہ کا رہنے والا تھا اور حضرت گنگوہی کے حالات بڑی عقیدت ومحبت اور دل چسپی سے سنایا کرتا تھا، جس کی وجہ سے آپ حضرت گنگوہیؒ سے بے عقیدت ہوگئی اور ایک بار موقع پا کر اپنے اسی ساتھی کے ہمراہ گنگوہ جا کر حضرت گنگوہیؒ کے مزار پر حاضری دی اور یہ دعا کی کہ اے اللہ! آئندہ مجھے بھی ایسی ہی باکمال اولاد عطا فرما! الحمدللہ دعا قبول ہوئی۔ اور جب آپ کی ولادت ہوئی تو حضرت گنگوہیؒ کے نام پر ہی عبدالرشید نام رکھا اور شروع سے دینی تعلیم کا خاص خیال رکھا۔

حضرت مولانا کی تعلیمی زندگی کا آغاز آپ کے گاؤں کھمریا کے مدرسہ سراج العلوم نامی مکتب سے ہوا۔ عربی تعلیم کے لیے مہوا بسم اللہ خان میں مدرسہ انوار العلوم میں داخلہ کرایا گیا، (بندہ نے بھی وہاں ایک سال ہدایہ اولین، نورالانوار اور مکمل مختصر المعانی کی تعلیم حاصل کی ہے۔) وہاں آپ نے کافیہ تک پڑھا، لیکن درمیان سال مدرسے کے اپنے داخلی مسائل کی وجہ سے آپ اپنے ان چند ساتھیوں کے ساتھ جو مدرسہ شاہی میں زیر تعلیم تھے مذکورہ مدرسہ میں آ گئے اور وہاں داخلہ بھی ہوگیا، آپ نے یہاں ڈیڑھ سال پڑھا پھر دارالعلوم دیوبند آ گئے۔ یہاں آپ نے تین سال پڑھ کر ۱۹۸۶ میں فراغت پائی۔ ایک سال

تکمیل ادب میں بھی لگایا۔ جہاں آپ نے استاذ محترم مولانا نور عالم خلیل امینی دامت برکاتہم سے بھی کافی استفادہ کیا، یہ وہ دور تھا جب حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ حیات تھے اور آپ کی مردم سازی اور آدم آفرینی کی ہر جگہ طوطی بول رہی تھی آپ کی خوش نصیبی کہ آپ کو حضرت کیرانویؒ جیسی شخصیت کی صحبت نصیب ہوئی جس نے اپنی خداداد صلاحیت اور آدم گری کی بے نظیر استعداد نے آپ کو عربی زبان و اداب کی دنیا کا شاہ جہاں بنا دیا۔

آپ کے ساتھ بندے کی وابستگی کا آغاز تو دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں ۱۹۹۰ء کے آغاز ہی میں ہو چکا تھا، تاہم اس وقت بندہ درجہ حفظ کا طالب علم تھا جس کی وجہ سے استفادے کا موقعہ نہ مل سکا، البتہ آپ کی عربیت کی شہرت کا شور پردۂ سماعت سے ضرور ٹکراتا تھا، درس وتدریس، نفاست اور نستعلیقیت نیز انداز تدریس کا امتیاز پورے مدرسے میں زبان زد خاص و عام تھا، جب حفظ سے عربی درجات میں منتقل ہوا تو عربی دوم کے سال آپ سے فقہ کی مشہور کتاب ''نورالایضاح'' کے چند اسباق پڑھنے کی سعادت ملی، لیکن یہ سلسلہ دس سے پندرہ دن سے زائد تک دراز نہ ہوسکا، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اسی دواران آپ مدرسے سے سبک دوش ہوکر دیوبند میں مرکز ترجمہ وتالیف قائم کردہ حضرت مولانا بدرالدین اجمل صاحب دامت برکاتہم سے وابستہ ہوگئے۔ آپ نے اس پلیٹ فارم سے بہت سارے کارہائے نمایاں انجام دئے، مختلف عربی کتابوں کا اردو اور چند اردو کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، بعض کتب پر حواشی اور نقد وتبصرہ بھی لکھا، نیز بعض کتب کی تخریج اور تحقیق بھی کی۔ اسی کے ساتھ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے نکلنے والے ماہانہ عربی مجلہ ''الداعی''میں بھی کاوش فکر وعلم کے گل کھلاتے رہے اور چند دنوں میں ہی بیشتر عربی مضامین اور روتر جموں کی اشاعت کا سہرا اپنے سر کرلیا، اس طرح آپ بہت جلد عوام وخواص میں عربیت کے تعلق سے ایک کہنہ مشق عربی و اردو داں، نیز انشا پرداز اور ماہر ترجمہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کرلی۔ آپ کی انہیں خصوصیات کی بنا پر دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری نے آپ کو ۱۹۹۸ء میں ادب عربی کا استاذ مقرر کیا، خوش قسمتی سے اسی سال بندہ بھی دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد ادب عربی سے وابستہ ہوا اور حضرت رحمہ اللہ سے استفادے کا موقعہ ملا۔ آپ کے درس کا انداز بے حد نرالا اور اچھوتا تھا، طلبہ میں عربی زبان وادب کا شوق پیدا کرنے میں آپ نادر المثال تھے، طلبہ کی ذہن سازی، حوصلہ افزائی کرنے میں آپ کبھی بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ آپ طلبہ کے شوق وذوق اور دل چسپی کو دیکھتے ہوئے کبھی بھی تعاون سے انکار اور گریز نہ فرماتے تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ طلبہ جو سامع کی حیثیت سے شریک درس ہوتے تھے اور ان میں عربی زبان کے تئیں دل چسپی ہوتی تھی تو ان پر یکساں توجہ مبذول کرتے تھے

اور اگر خارجی اوقات میں اگر کوئی سامع طالب علم بھی توجہ اور تعاون کا خواہاں ہوتا تو ہرگز کبیدہ خاطر نہ ہوتے، انھیں خوبیوں کی وجہ سے آپ کی محبوبیت طلبہ میں بے مثال تھی۔

دارالعلوم دیوبند میں آپ کی تدریسی خدمات تقریباً دو سالوں تک اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جاری وساری رہی، اور بے حد قلیل عرصے میں آپ شہرت کے بام عروج پر پہنچ گئے، لیکن اچانک کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ آپ کو دارالعلوم دیوبند کو الوداع کہنا پڑا، یہ حادثہ آپ کے لیے انتہائی جاں کاہ تھا، تاہم توفیق ایزدی اور اس کی دست گیری سے چند دنوں میں سب کچھ آسان ہو گیا۔ چوں کہ آپ کی صلاحیت اور صالحیت جگ ظاہر تھی اور آپ کی خوبیاں کسی سے بھی ڈھکی اور چھپی نہ تھیں، اس لیے دارالعلوم دیوبند کی انتظامی کارروائی کی وجہ سے آپ کی سبک دوشی کے بعد قدردان علم ودانش نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، چناں چہ مدینہ العلم دیوبند ہی میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے علوم کے وارث، عظیم سپوت اور شخصیت شناس مرد خود آگاہ حضرت مولانا انظر شاہ مسعودی صاحب رحمہ اللہ نے آپ کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا، پھر کیا تھا، حضرتؒ نے جامعہ انور جو ان دنوں معہد انور کے نام سے مشہور تھا کے انتظام وانصرام اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کی سوغات آپ کی جھولی میں ڈال دی، آپ نے بھی محنت ولگن کے ساتھ وفاداری کی ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر ملنی مشکل ہے، چناں چہ آپ روز اول سے تادم مرگ جامعہ ہی سے وابستہ رہے، اور اس کی ترویج وترقی میں نمایاں اور مثالی کردار ادا کیا، جامعہ کو اپنی گوناں گوں خوبیوں اور صلاحیتوں سے ترقی کے بام عروج پر پہنچاتے ہوئے مالک حقیقی سے جا ملے۔

دارالعلوم دیوبند میں ادب عربی کے شعبے میں تعلیم کے دوران مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا، آپ کی خدمت اور آپ سے استفادے کا بھی کافی موقعہ میسر آیا، آپ کی لطف ومہربانی اور نرم خوئی بھی دیکھی، اور دوران درس آپ کے انضباط اور اصولی شدت کو بھی محسوس کیا، یوں تو عربی زبان وادب کی داغ بیل اور اس کے تئیں شوق وذوق دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں حضرت الاستاذ مولانا ظہیر انور صاحب دامت برکاتہم کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے ہوئے پیدا ہوا، آپ مظاہر العلوم سہارن پور سے فارغ ہوئے تو عربی زبان وادب کا شوق آپ کو دیوبند کھینچ لایا جہاں باوجودیکہ آپ دوسرے مدرسے کے فارغ تھے آپ کی ذہانت اور شوق وذوق اور بے حد دل چسپی کے پیش نظر حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ نے آپ کو اپنا خصوصی شاگرد بنا لیا، اور اپنی خصوصی توجہ سے آپ کی عربی صلاحیت کو جلا بخشتے ہوئے آپ کو کندن بنا دیا۔ دارالعلوم الاسلامیہ میں تعلیم کے دوران بندہ نے آپ ہی کے زبان وادب کے چشمۂ فیاض بے حد مستفید ہوا، اور عربی زبان کی بنیادی کتاب ''القرائۃ الواضحۃ'' پڑھی، اسی ایک کتاب اور استاذ محترم مدظلہ

کے انوکھے اور دلربا طریق تدریس کی برکت سے عربیت کا وہ نشہ چڑھا جو کبھی بھی نہیں اترا، تاہم ابھی یہ درخت جس کی تخم ریزی حضرت الاستاذ مولانا ظہیر انور صاحب دامت برکاتہم نے کی تھی اسے تناور اور بارآور درخت بننے کی ضرورت تھی اور اس پر کسی کہنہ مشق اور مربی جلیل صیقل نگاہ شخصیت کی توجہ کی حاجت تاہنوز باقی تھی، چناں چہ اس مبارک کام کے لیے اللہ رب العزت نے حضرت الاستاذ مولانا عبدالرشید صاحبؒ کا انتخاب فرمایا، اس مردقلندر کی توجہات، بے پناہ شفقت ومحبت اور نادر انداز تربیت نے بندہ کی عربیت کے ننھے پودے کو ایک تناور درخت ہی نہیں بلکہ اسے بارآور بھی بنادیا، آپ ہی کی ذات گرامی وہ عظیم شخصیت ہے جس کی توجہ اور تربیت کے باعث یہ ناچیز عربی اور اردو زبان میں چند کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لائق ہوا، جن میں چارسو صفحات پر مشتمل سیرت رسول ﷺ اور نظریہ رنگ ونور نیز سوانح امام نووی، امام الحرمین اور سفیان بن عیینہ قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر سوانح پر مشتمل کتاب زیر طباعت ہے اوران شاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آجائے گی۔

دارالعلوم دیوبند میں قیام کے دوران آپ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا، درس گاہ سے رہائش ہر جگہ آپ کے چشمہ علم سے سیراب ہونے کی سعادت ملی، آپ کے ساتھ چند مسودات پر بھی کام کرنے کا اتفاق ہوا، آپ کی طبیعت میں علمی فیاضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، کسی بھی طالب علم کو خواہ وہ مدرسے سے وابستہ ہو یا سامع کی حیثیت سے پڑھ رہا ہو، آپ کی توجہات میں کبھی کمی نہیں آئی، ہر ایک وارد وصادر کو یکساں موقع فراہم کرتے تھے، تھوڑا ہو یا زیادہ، کچھ بھی کرنے پر حوصلہ افزائی کرتے، درس گاہ میں طلبہ کی تعلیمی تربیت اس انداز سے کرتے کہ کند ذہن اور تعلیم میں کمزور طالب علم بھی اپنی ہتک اور رسوائی محسوس نہ کرتا۔ ممبئی میں اپنے قیام کے دوران حضرت مولانا سے ایک دوبار ملاقات ہوئی، ایک بار گھر پر بھی تشریف لائے، البتہ ادھر کئی سالوں سے بالمشافہ ملاقات کا موقع میسر نہ آسکا، البتہ فون پر بات ہوتی رہی ہے، ابھی حال ہی میں انتقال سے تقریباً دو ہفتے قبل تفصیل سے بات ہوئی، حضرت نے کمپنی سے نکل کر مدرسے کی دہلیز پر آنے اور خدمت کرنے پر خوشی کا اظہار کیا اور بے انتہا سراہا، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا نے کی دعوت دی تو فرمایا کہ اگر کوئی ایسا موقعہ میسر آیا تو ضرور آؤں گا۔ کسے پتہ تھا کہ یہ حضرت کی بندہ کے ساتھ آخری گفتگو تھی، اوراب اس کے بعد آخرت ہی میں ہم کلامی کا شرف مل سکتا ہے، دعا ہے اللہ پاک جنت الفردوس میں اولیاء اور انبیاء وصالحین کی معیت میں آپ کی رفاقت عطا فرمائے۔ آمین

۞۞۞

زبان وادب کے شہ سوار، صلاحیت وصالحیت کے علمبردار

استاذِ محترم حضرت مولانا عبدالرشید بستویؒ

مولانا بدرالاسلام قاسمی

استاذ جامعہ ہذا

۲۵/اکتوبر۲۰۱۸ء بروز جمعرات بعد نماز مغرب اچانک یہ اطلاع ملی کہ استاذ محترم حضرت مولانا عبدالرشید بستوی صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ یہ خبر ایسی غیر متوقع تھی کہ سنتے ہی ذہن ماؤف ہوگیا، دماغ حیران وششدر اور دل رنج والم میں غرق۔ لرزتے ہاتھوں سے فون رسیو کیے اور کانپتی زبان سے استاذ محترم کے سانحۂ وفات کی تصدیق کی۔ اسی کیفیت میں حضرت کے گھر کی طرف لپکا جہاں اساتذہ وطلبہ کا جم غفیر پہلے سے موجود تھا، ہر شخص ایک غیر یقینی کیفیت سے دوچار، آنکھیں نم اور سب ایک دوسرے کو تعزیت پیش کرتے ہوئے۔ کچھ دیر میں حضرت مولانا کا جسد خاکی میرٹھ سے لایا گیا۔ بندے نے اس سے قبل کئی جنازے دیکھے، لیکن حضرت مولانا کے چہرے پر جو سکون واطمینان کی کیفیت نظر آرہی تھی ایسی کیفیت خال خال ہی جنازوں پر نظر آئی۔ نم آنکھوں اور مجروح قلب کے ساتھ مولانا کی زیارت کی، طلبہ ومتعلقین کا ہجوم بڑھتا جارہا تھا، سب آخری دیدار کے لیے بے چین تھے۔ دارالعلوم، دارالعلوم وقف اور دیگر مدارس کی بڑی بڑی شخصیات تعزیت مسنونہ کے لیے پہنچ رہی تھیں۔ اگلے روز مؤرخہ ۲۶/اکتوبر بعد نماز جمعہ احاطہ مولسری میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور پھر حضرت الاستاذ کو اسی شخصیت سے منسوب قبرستان میں دفن کیا گیا جن کے علوم کے وہ دلدادہ تھے، اس شخص کے قریب جن کے وہ عاشق زار اور لاڈلے تھے۔

کچھ یادیں

یہ ۲۰۰۳ء کی بات ہے، دارالعلوم وقف کے قریب ہی ایک ادارہ قائم ہوئے ابھی دو تین سال ہی گزرے تھے کہ اس کا چرچا، اس کے تذکرے ہر ذی علم کی زبان پر تھے، ادارے کا نام تھا ''معہد الانور''

بندہ اس وقت شعبۂ حفظ سے فارغ ہوا تھا، عربی درجات کی تعلیم کے لیے والد محترم نے اسی معروف ومقبول ادارے کا انتخاب کیا۔ جب طلبہ سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہاں کا نظام تعلیم بہت سخت ہے، غلطیوں پر سخت تنبیہ کی جاتی ہے، نیز داخلہ موقوف ہونے کے بعد کسی کی سفارش کام نہیں آتی، اور اس پورے نظام کی باگ ڈور حضرت مولانا عبدالرشید بستویؒ کے ہاتھوں میں ہے۔

حضرت سے استفادہ

بندے کو حضرت مولانا سے معہد میں کئی کتابیں پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ عربی اوّل میں القراءۃ الواضحہ اوّل آں محترم سے ہی متعلق تھی، خوب اچھی طرح یاد ہے جب وہ پہلا سبق پڑھانے درس گاہ میں تشریف لائے تو ان کا علمی رعب تمام ہی طلبہ نے محسوس کیا۔ رہن سہن کے اعتبار سے مولانا کو دیگر حضرات سے منفرد پایا، سادہ لباس، قدرے چھوٹا کرتا۔ چہرے پر متانت وسنجیدگی، درس کا ایک ایک جملہ مرتب اور طلبہ کے ذہن میں اترتا ہوا۔ مذکورہ کتاب مولانا نہایت دلچسپی وشوق سے پڑھاتے، عربی عبارت پڑھنے کا لہجہ ان کے یہاں بہت معنی رکھتا تھا، عربی اوّل کے طلبہ نہ تو جملے کے قواعد اور ساخت سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی معرب ومبنی یا منصرف وغیر منصرف کی گتھیوں کو سلجھانے کے اہل، لیکن اس کے باوجود وہ اس انداز میں پڑھاتے کہ تمام طلبہ خواہ ان کا ذہن کسی بھی معیار کا ہو، وہ مکمل سبق سمجھتے، معرفہ ونکرہ کے ترجمے میں فرق ملحوظ رکھتے، ٹوٹے پھوٹے انداز میں عربی بولنے کی کوشش کرتے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ ان کے دلوں میں ہمیشہ موجزن ہوتا۔ قواعد سمجھانے کے لیے مولانا بلیک بورڈ کا استعمال فرماتے۔ ذہن میں اچھی طرح سے نقش ہے کہ جب سبق میں اَحْمَرُ اور حَمْرَاءُ کا لفظ آیا تو مولانا نے ہمیں صرف یہ سمجھایا کہ جو اسم اَفْعَلُ یا فَعْلَاءُ کے وزن پر ہو اس پر تنوین نہیں آئے گی اور کسرہ کی جگہ پر فتحہ آئے گا۔ کافی دنوں کے بعد ہمیں یہ معلوم ہوا کہ مذکورہ اوزان غیر منصرف کے ہیں، ''غیر منصرف'' کا تلفظ کیے بغیر اس کا ضابطہ، اس کے اعراب ہمارے ذہن پر نقش تھے جو مولانا کے بے نظیر اندازِ تدریس کا ہلکا سا نمونہ تھا۔ جس وقت وہ سبق سمجھاتے طلبہ کا کاپی قلم استعمال قطعی طور پر ممنوع تھا، فرماتے کہ جب میں سمجھا رہا ہوں تو پوری توجہ سے میری بات سنو، ان شاء اللہ لکھنے کی ضرورت پیش ہی نہیں آئے گی۔ اور واقعی جب وہ سبق کے ضابطے سمجھا کر فارغ ہوتے تو تمام قواعد طلبہ کے ذہن نشین ہوتے۔

عربی چہارم کے سال میں حضرت سے متعلق دو کتابیں رہیں (١) الفیۃ الحدیث (٢) القراءۃ العربیہ سوم۔ اوّل الذکر کتاب پڑھانے کا انداز یہ رہا کہ عبارت کا سلیس ترجمہ فرماتے اور مختصر سی تشریح کرتے، لمبی چوڑی بحث سے گریز فرماتے، حدیث کا بنیادی مفہوم اور مقصد ہمارے سامنے ہوتا۔ البتہ مؤخر الذکر

کتاب کا فن یعنی ’’عربی زبان وادب‘‘ چوں کہ مولانا کا اصل میدان تھا، اس کی تدریس میں مولانا کی شان ہی الگ تھی، طلبہ عبارت دیکھ کر آتے، مولانا سلیس ترجمہ فرماتے اور پھر اس کی تعبیرات وتدریبات پر مکمل مشق کراتے۔ طلبہ کی حوصلہ افزائی اور خورد نوازی کا جذبہ اللہ تعالیٰ نے خوب عنایت فرمایا تھا، چناں چہ القراءۃ العربیہ کا ایک سبق جو تاریخی حقائق اور عمدہ عربی تعبیرات پر مشتمل تھا طلبہ جب اس کا ترجمہ کر کے لائے تو معہد الانور سے شائع ہونے والے وقیع ماہ نامہ ’’محدثِ عصر‘‘ میں اسے شائع کرایا۔

ایک دن القراءۃ العربیہ کی ساعت میں مولانا درس گاہ تشریف لائے تو علامہ اقبالؒ جن سے اُن کو کافی عقیدت تھی کے اشعار گنگنا رہے تھے، ہم نے توجہ سے سننا چاہا تو ان کے تین اشعار ہمیں سنائے جو درج ذیل ہیں:

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے
(اقبال)

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے
مصائب میں الجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا
(اصغر گونڈوی)

ہم نے شوق شوق میں اشعار لکھ لیے۔ مولانا نے فرمایا: ’’کل ان کی عربی بنا کر لانا۔‘‘ یہ جملہ ہمیں ایک ناقابلِ یقین صورت حال سے دو چار کر گیا، کیوں کہ اب تک نثری جملے اور مضامین کی مشق سے تو ہمیں کچھ مناسبت ہوگئی تھی، لیکن اچانک اشعار کا ترجمہ، اور وہ بھی علامہ اقبال کے۔ خیر! مولانا کے فرمان پر عمل کے سوا کوئی راہ نہیں تھی، اتنی ہمت تو کسی میں نہ تھی کہ حضرت کے حکم کو پس پشت ڈال دے یا ان سے معذرت کرے۔ چناں چہ ہم لوگ جیسے تیسے (علامہ اقبال کی روح سے معذرت کے ساتھ) ٹوٹا پھوٹا ترجمہ کر کے لائے، مولانا نے اصلاح فرمائی اور حوصلہ افزا کلمات بھی ارشاد فرمائے۔

عربی زبان وادب سے مولانا کو صرف دلچسپی نہ تھی، بلکہ عشق تھا اور عشق بھی بہت شدت کے ساتھ، القرائۃ العربیہ پڑھانے کے دوران کبھی کبھی جوش میں آتے تو کہتے کہ دل چاہتا ہے کہ ماہنامہ ’’محدثِ عصر‘‘ کی طرح معہد سے ایک عربی رسالہ بھی جاری کیا جائے۔ اسی دلچسپی بلکہ عشق کی بنیاد پر وہ ہر اُس چیز کے سخت مخالف تھے جو طلبہ کی بنیادی استعدادسازی کے لیے رخنہ بنے، چناں چہ بہت اچھی طرح یاد ہے کہ

میں عربی دوم میں تھا، اچانک تمام طلبہ کو حضرت مولانا نے جمع کرایا اور ایک اصلاحی گفتگو کی جس کا موضوع تھا ''اردو شروحات کی تباہ کاریاں''۔ اس اجلاس سے پہلے ہمیں اپنے لیے نافع یا نقصان دہ کتابوں یا شروحات کے درمیان کوئی امتیازی شعور نہ تھا، لیکن حضرت مولانا نے اس مختصر سی مجلس میں اردو شروحات کی تباہ کاریاں نہایت عمدہ اور مدلل انداز میں بیان کیں، نیز یہ بھی فرمایا کہ ہمارے اسلاف واکابر نے بھی اردو شروحات لکھی ہیں، لیکن اُنھیں اس کا حق تھا، وہ شرح کمانے کے لیے نہیں بلکہ حل کتاب کے لیے لکھتے تھے، لیکن آج کل جو رواج چل پڑا ہے کہ نئے نئے فضلاء مصنف بننے کے چکر میں اردو شروحات لکھ رہے ہیں، یہ نہایت نقصان دہ ہے، اردو شروحات بڑھاپے کی لاٹھی کی مانند ہے، اگر جوانی میں ہی اس کی عادت ہوجائے تو اس کا نقصان بالکل واضح ہے۔ اُن کا یہ جملہ آج بھی کانوں میں بالکل تازہ ہے کہ ''یہ اردو شروحات استعداد ساز نہیں، بلکہ استعداد سوز ہوتی ہیں۔'' ویسے تو بندے کو علم سے جو بھی مناسبت ہے وہ یہ حضراتِ اساتذہ کا ہی فیض ہے، لیکن میں حضرت مولانا کی اس جوشیلی اور پُرسوز تقریر کا تاعمر شکر گزار رہوں گا جس نے ناتجربہ کار حضرات کی اردو شروحات سے دل کو متنفر کردیا، چناں چہ اُس دن سے تا فراغت بندے نے کبھی کسی اردو شرح سے استفادہ نہیں کیا، حضرت مولانا کی نصیحت کے مطابق اسباق کی پابندی اور حاشیہ بینی پر اکتفا کیا جس کا فائدہ واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔

عربی زبان وادب کے اس عشق کا ایک اور مظاہرہ اسی سال عربی دوم میں دیکھنے کو ملا، جب مولانا نے بطور ''ناظم تعلیمات'' یہ ہدایت جاری کی کہ عربی دوم سے اوپر کی جماعتوں میں درس عربی زبان میں ہونا چاہیے، یہ فیصلہ دیوبند کی تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ کسی مدرسے میں جاری ہوا تھا، چناں چہ اس کے بعد قدوری وغیرہ کے اسباق عربی میں ہی ہونے لگے۔ افسوس یہ سلسلہ سال دو سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا، مولانا کی یہ انقلابی پہل مختصر وقت کے لئے صحیح بڑی کامیاب ثابت ہوئی اور طلبہ کے معیار میں قابلِ ذکر ترقی محسوس کی گئی۔

عربی اسباق کی ہدایت کے بعد پورے مدرسہ کو ''عربی میڈیم'' بنانے کی جانب مولانا نے مختلف اقدامات کیے، چناں چہ دفتر سے جاری ہونے والے اعلانات وتحریرات عربی زبان میں آویزاں ہوتے، اس وقت چوں کہ بندہ عربی دوم کا طالب علم تھا تو ہم ابتدائی جماعت کے طلبہ بھی اعلانات کو حل کرنے کی کوشش کرتے، کچھ خود سمجھتے اور کچھ عربی سوم وچہارم کے طلبہ سے پوچھ کر حل کرتے، اس ماحول کا اثر طلبہ میں بھی نظر آنے لگا، چناں چہ طلبہ درخواستیں عربی زبان ہی میں داخلِ دفتر کرتے۔

مذکورہ صفات کو دیکھ کر بلا شبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا معہد الانور میں عربی زبان وادب کی فضا

ہموار کر کے ویسا علمی انقلاب لانا چاہتے تھے جیسا ان کے استاذِ خاص ومربی حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ دارالعلوم دیوبند میں لائے تھے۔

عربی پنجم میں حضرت مولانا سے ہدایہ اوّل کا درس متعلق تھا، عید الاضحیٰ کے کچھ دنوں بعد تک تو مولانا نے ترجمہ ومطلب کی ذمہ داری لی، اس کے بعد وہ عبارت کا ترجمہ نہ کراتے، بلکہ صرف مطلب بیان کرتے، البتہ اگر کہیں پیچیدہ عبارت ہوتی تو وہاں مطلب کو عبارت سے ضرور منطبق فرماتے، مولانا کے اس طرزِ تدریس سے ہمیں بہت فائدہ ہوا، چوں کہ ہماری جماعت میں قدیم طلبہ سے حضرت کو کافی مناسبت تھی، اس لیے اب مولانا دورانِ درس کچھ خارجی گفتگو بھی فرماتے۔ اپنے اساتذہ کا تذکرہ، اکابر کے سبق آموز واقعات، اس دوران نہ مبالغہ آرائی اور نہ ہی مغالطہ سازی۔

حضرت مولانا سے استفادے کا براہ راست سلسلہ اس سال کی تکمیل پر موقوف ہوگیا، بندے نے دارالعلوم وقف میں داخلہ لے لیا، اس دوران مولانا سے وقتاً فوقتاً ملاقات ہوتی رہی، البتہ ان کا رعب و دبدبہ ہمارے ذہنوں پر سوار تھا، اس لیے ان سے زیادہ قریب ہونے کی ہمت نہ کرسکا۔

حضرت مولانا میں درس وتدریس کے علاوہ کچھ خاص صفات بھی تھیں، جو درج ذیل ہیں:

طلبہ پر اعتماد اور ان کا اکرام

حضرت مولانا کو طلبۂ مدارس پر مکمل اعتماد تھا، بارہا درس میں بھی اس کا اظہار فرماتے، کبھی کوئی طالب علم خریداری سے بچی ہوئی رقم لاکر دیتا تو اس کو شمار نہ کرتے، اس اعتماد کی بنیاد پر جب مع اہل خانہ انھیں کہیں سفر پر جانا ہوتا تو گھر طلبہ کے حوالے کر کے جاتے۔ طلبہ کے تعلق سے شفقت ومحبت کا جذبہ بارہا دیکھنے کو ملتا، چناں چہ وقتاً فوقتاً طلبہ کی دعوتیں کرتے، بالخصوص چھٹی کے ایام میں اگر کوئی طالب علم جامعہ میں مقیم رہتا تو اس کی ضیافت کا اہتمام کرتے۔

طلبہ کے ساتھ کھیلنا

حضرت مولانا کا جو علمی دبدبہ اور رعب ہمارے قلب ودماغ پر سوار تھا، اُسے دیکھتے ہوئے یہ عنوان تھوڑا غیر یقینی لگتا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جس سال ہم غالباً عربی چہارم میں زیر تعلیم تھے، معہد الانور کی انتظامیہ کی جانب سے ''کرکٹ'' کھیلنے پر پابندی عائد کر دی گئی، چوں کہ حضرت مولانا کا ہی نظریہ تھا کہ طلبہ کو کھیل کود میں بھی خوب حصہ لینا چاہیے، اس وجہ سے کرکٹ کے متبادل کے طور پر معہد کے احاطہ میں ہی ''والی بال'' کھیلنے کا نظم کیا گیا۔ طلبہ کی اکثریت اس کھیل کے اصول وضوابط سے ناواقف تھی، اس لیے

حضرت مولانا نے معہد کے استاذ شعبۂ حفظ جناب قاری بلال احمد صاحب کے ساتھ مل کر اس کھیل کی قیادت سنبھالی، دونوں استاذوں نے ایک ایک ٹیم سنبھالی اور صرف معہد ہی نہیں، بلکہ دیوبند کے مدارس کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ وہی طلبہ جو حضرت مولانا کے شاگرد تھے، عصر تا مغرب پابندی سے مولانا کے ساتھ کھیل میں شریک ہوتے، مولانا کا جوش وجذبہ کھیل کے تعلق سے بھی قابل رشک تھا۔ یقیناً حضرت مولانا کا یہ عمل قابل تقلید ہے، اور ہمارے طبقے کے ان تنگ نظر افراد کے لیے ایک لمحہ فکر یہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ طلبہ کے ساتھ مسکرا کر بات کرنا یا ان کے ساتھ نشست و برخاست اساتذہ کے وقار کے خلاف ہے، ساتھ کھیلنے کا تو اُن کے یہاں تصور ہی نہیں۔ ہم نے حضرت مولانا کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور آں محترم کے ساتھ کھیل میں حصہ بھی لیا۔ یہ دونوں ہی امور ہمارے لیے قابلِ فخر ہیں۔

چھوٹوں کی حوصلہ افزائی

۲۰۰۹ء میں دار العلوم وقف سے فراغت کے بعد بندے کو مادرِ علمی معہد الانور (جو اَب جامعہ امام محمد انور شاہ بن چکا تھا) کی تدریسی خدمت کا موقع ملا، جہاں ایک طرف یہ بہت بڑی سعادت تھی، دوسری جانب دل میں ایک خوف کہ اپنے اساتذہ کی موجودگی میں وہاں تدریسی فرائض کیسے انجام دیے جائیں۔ بہر حال پہلے سال مجھ سے ہدایہ اوّل کا درس متعلق تھا، چوں کہ بندے نے ہدایہ اوّل حضرت مولانا سے ہی پڑھی تھی اس لیے میں نے اُن سے درخواست کی کہ آں محترم کتاب کا آغاز فرمادیں، مولانا نے اس درخواست کو بخوشی قبول کیا اور ہدایہ کے پہلے درس کے دوران بندے سے متعلق نہایت حوصلہ افزا کلمات بھی ارشاد فرمائے، نیز مخلصانہ و مشفقانہ دعاؤں سے بھی نوازا۔

معہد کے ہر شعبہ کے لیے جدوجہد

عربی اوّل (۲۰۰۳ء) کے اخیر سال میں یہ طے پایا کہ انجمن کواکب انور کا سالانہ اجلاس منعقد کیا جائے، جس میں طلبہ اپنی تقریری و دیگر صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکیں۔ حضرت مولانا مع دیگر اساتذہ کے اس اعلان کے بعد دن رات اجلاس کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ مولانا نے فیصلہ کیا کہ طلبہ عربی و اردو کے علاوہ فارسی، انگریزی اور ہندی زبان میں بھی تقریر پیش کریں گے، نیز اُن کو دعوتِ اسٹیج دینے کے لیے اُن سے متعلق پروگرام کی زبان ہی استعمال کی جائے، چناں چہ شبانہ روز جدوجہد کے بعد وہ اجلاس منعقد ہوا اور کیا خوب کامیاب رہا، شروع سے آخر تک سامعین اپنی جگہ سے نہ ہل سکے، نیز انگریزی، ہندی اور فارسی میں تقریر و نظامت، یہ سامعین کے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ پروگرام نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے، کئی

ہفتے تک لوگوں کی زبان پر پروگرام کے تعلق سے عمدہ تبصرے رہے۔

معہد کی نیک نامی میں مولانا کا نمایاں کردار

اس بات میں ذرّہ برابر بھی شک نہیں کیا جاسکتا کہ جامعہ امام محمد انور شاہ کو اتنی قلیل مدت میں جو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی ہے اس میں اللہ کے فضل وکرم، بانیٔ معہد حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کا اساتذہ و کارکنان کا حسنِ انتخاب وسرپرستی، رئیس الجامعہ کی نگرانی، اساتذہ وکارکنان کی محنتوں کے ساتھ حضرت مولانا کی شبانہ روز جدو جہد، بے نظیر نظامتِ تعلیمات، اصولوں کی پابندی، انتظامی امور پر مکمل عبور کا بہت بڑا دخل ہے۔

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

حضرت مولانا کا وصال ویسے تو پوری علمی دنیا کا خسارہ ہے، لیکن معہد الانور کو جامعہ امام محمد انور شاہ تک کا سفر طے کرانے اور شہرت ومقبولیت کی اوجِ ثریا پر پہنچانے میں عظیم کردار نبھانے والے حضرت مولانا عبدالرشید بستویؒ کو جامعہ ہمیشہ یاد رکھے گا، اُن کی خدمات تابندہ و پائندہ رہیں گی۔

امید ہے کہ حضرت کے صاحبزادے مولانا عبداللہ قاسمی بستوی مولانا کے نقشِ قدم پر چلیں گے اور والدمحترم کے علمی وعملی جانشین ثابت ہوں گے۔ ان شاءاللہ

۞۞۞

رحلت ایک عالم دین کی

عمر الٰہی عثمانی
دارالعلوم وقف دیوبند

۲۵/اکتوبر ۲۰۱۸ء بروز جمعرات، مغرب کے بعد اچانک میرے ایک دوست عارف عثمانی صاحب کا فون آیا،فون ریسیو کرتے ہی انہوں نے یک لخت کہا کہ بھائی عمر! مولانا عبدالرشید صاحب کا انتقال ہوگیا! انہوں نے اتنے آناً فاناً میں یہ خبر دی کہ اوّل مرحلہ میں تو میں سمجھ ہی نہیں پایا کہ کون مولانا عبدالرشید صاحب! پھر میں نے انتہائی حیرت اور تعجب سے پوچھا کہ ''ہمارے مولانا عبدالرشید صاحب'' جواب ملا''جی جی ہمارے مولانا'' یہ خبر میرے دل پر صاعقہ بن کر گری اور اُس وقت ذہن و دماغ کی جو کیفیت ہوئی وہ سپرد قلم نہیں کی جاسکتی۔مولانا اگر چہ کئی سال سے شوگر کے مرض میں مبتلا تھے؛لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی اوراچانک ہم سے جدا ہوجائیں گے۔

مولانا انتہائی سنجیدہ،کم گو،خاموش طبیعت،منکسرالمزاج اور باوقار شخصیت کے حامل تھے۔مولانا سے میرا دیرینہ تعلق رہا،بہت سی مجالس میں ان کے ساتھ نشست و برخاست اور سنجیدہ ہنسی مذاق رہا،دارالعلوم وقف میں بھی وقتاً فوقتاً میرے پاس آتے،نیوز پوائنٹ (دیوبند میں واقع مقامی نامہ نگاروں کا دفتر) بھی کبھی بعد عصر اور کبھی بعد مغرب تشریف لاتے،علمی گفتگو کرتے ادبی چٹکیاں چھوڑتے۔مجلس و محفل میں جہاں احباب بلا تکلف کلام کرتے ہیں وہاں بھی مولانا اپنے وقار کو قائم رکھتے اور محتاط اور سنجیدہ گفتگو کرتے،کبھی بے وزن اور ہلکی بات نہ کرتے،بہت زیادہ ہنسی کی کوئی بات ہوتی تو ہلکا سا تبسم فرماتے۔

مولانا کا درس طلباء کے درمیان مقبول تھا،اندازِ درس سادہ مگر جامع تھا،دورانِ درس گنجلک عبارات کو سلجھاتے اور رکیک مسائل پر گفتگو کرتے۔ اردو اور عربی زبان پر یکساں قدرت حاصل تھی، ان کی تحریریں شستہ،سادہ اور جاذب نظر ہوتیں،مولانا زود نویس تھے،مضمون نویسی پر اتنی مہارت کہ قلم اٹھانے

کی دیر تھی پھر تو کیسا ہی موضوع ہو اور کیسا ہی عنوان؛ اُن کا قلم پانی کی طرح رواں دواں رہتا اور مضمون کے تکمیل پر ہی جا کر ٹھہرتا۔

قلم پر مہارت حال یہ تھا کہ ایک بار قاری ابوالحسن صاحب کی کتاب ''افکار و تأثرات'' کتابت کے آخری مرحلے میں تھی، قاری صاحب اور مولانا عبدالرشید صاحب دونوں حضرات میرے پاس تشریف فرما تھے، قاری صاحب نے مولانا سے اپنی کتاب پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی، قاری صاحب اور مولانا مرحوم کے چوں کہ دوستانہ تعلقات تھے، مولانا نے کاغذ اور قلم اٹھایا اور بلا تکلف چند منٹوں میں مذکورہ کتاب پر ایک وقیع تحریر'' بکھرتے سمٹتے حروف'' کے عنوان سے لکھ ڈالی۔

چوں کہ مولانا مرحوم کے مضامین، مقالات اور کتابوں کی کتابت مجھ سے ہی متعلق رہتی، اس لئے ان کی قلمی کاوش کو مطالعہ کرنے اور ان کے لکھنے پڑھنے کے انداز کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میرے کام کرنے کے انداز سے بڑے مطمئن ہوتے اور فرماتے کہ میری تحریریں تم بہ آسانی پڑھ لیتے ہو، دوسرے کاتب میری تحریر نہیں پڑھ پاتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتابت میں اغلاط بہت رہ جاتی ہیں۔ اکابر و اسلاف کے طرز پر اپنا کام خود کرنے کے عادی تھے، میری رہائش گاہ پر اپنے مسوّدات اور پرنٹ لینے دینے کے لئے پہلے فون کرتے، پھر خود تشریف لاتے، اپنے ذاتی امور کے لئے شاذ و نادر ہی طلبہ کا استعمال کرتے تھے، وفات سے چند روز قبل بھی سیمیناروں کے دو مختلف عناوین پر مجھ سے مقالات کتابت کروائے جن کے عنوان درج ذیل ہیں ''تفقہ فی الحدیث اور امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ'' اور ''افکار پریشاں: اپنے متنوع مشتملات اور خصائصِ اسلوب کے آئینہ میں''۔ مولانا کو علوم انوری سے کافی مناسبت تھی اور اس پر انہوں نے قابل ذکر کئی کام بھی کئے۔ مولانا کے اس طرح اچانک چلے جانے سے دل پر گہرا اثر ہوا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت کاملہ فرمائے اور جنّت الفردوس میں ٹھکانہ بنائے۔ آمین

❁❁❁

جامعہ کی سرگرمیاں

مولانا فضیل احمد ناصری
استاذ حدیث جامعہ ہذا

ششماہی امتحان کا انعقاد

امتحان طلبہ کی استعداد بڑھانے میں مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ طلبہ کہاں کھڑے ہیں اور ان کا سفر کس سمت میں ہے۔ امتحان کے نتائج سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ اب کرنا کیا ہے؟ دیگر مدارس کی طرح جامعہ میں بھی اسے بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کا اہتمام اس درجہ ہے کہ بڑے امتحانات میں ممتحن دوسرے بڑے اداروں سے تشریف لاتے ہیں۔ جامعہ کا ششماہی امتحان 3 سے 7 نومبر تک منعقد ہوا۔ حسبِ سابق امتحانی پرچے بیرونی ممتحنین کرام نے بنائے، جن میں دارالعلوم دیوبند، وقف اور اطراف و جوانب کے ماہر مدرسین شامل ہیں۔ تقریری امتحان کے لیے ان ممتحنین نے تشریف لاکر طلبہ کی تیاریوں کو قریب سے دیکھا اور اپنی تجزیاتی تحریر قلم بند کی۔ نیز مفید مشوروں سے نوازا۔

تعطیل ششماہی کے بعد تعلیم کا آغاز

ششماہی امتحان کے بعد 11 روز کی تعطیل بھی جامعہ میں رہی۔ قریب اور دور کے اکثر طلبہ اپنی اپنی پسندیدہ منزلوں کی طرف چلے گئے۔ بعض طلبہ جامعہ میں ہی مقیم رہے، جن کے طعام کا نظم من جانب ادارہ رہا۔ جاتے وقت طلبہ کو بطورِ خاص آدابِ سفر بھی بتائے گئے تاکہ وہ کسی ناخوشگوار واقعے کا حصہ نہ بن سکیں۔ بابری مسجد کا فیصلہ عنقریب ہی آنا تھا، اس لیے انہیں مزید تاکید و تنبیہ کی گئی تھی کہ سفر میں سیاسی اور حساس موضوعات بھی کوئی گفتگو ہرگز ہرگز نہ کریں۔ 8 نومبر سے 19 تک تعطیل رہی۔ ہر جماعت کی ایک کتاب بغرضِ امتحان روک لی گئی تھی، جس کا امتحان واپسی کے بعد پہلے سے طے شدہ تاریخ پر ہوا۔ الحمدللہ سارے ہی طلبہ بروقت آگئے اور امتحان کے بعد تعلیمی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے۔ مطبخ بھی ہاتھوں ہاتھ جاری ہوگیا۔

انجمن کواکبِ انور کے ششماہی مسابقے کا خوب صورت انعقاد

جامعہ میں نصابی تعلیم کے ساتھ تقریری وتحریری صلاحیت سازی پر بھی خصوصی توجہ مبذول کی جاتی رہی ہے۔ انجمن کواکبِ انور کے پلیٹ فارم سے جس طرح ہر ہفتے تقریری اور ہر ماہ تحریری مشق وتمرین ہوتی ہے، اسی طرح ان دونوں کے مسابقے بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ 24 اکتوبر 2019 کو محترم مولانا سعدان جامی بجنوری زیدمجدہم کی صدارت میں انجمن کا ششماہی حتمی مسابقۂ خطابت منعقد ہوا، جس کے لیے دو دورانیے تھے۔ پہلا دورانیہ پچھلی جمعرات میں تھا، اس میں کل 70 طلبہ نے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھلائے۔ ان میں سے منتخب دس طلبہ کو حتمی مسابقے میں جگہ دی گئی اور پہلی تین پوزیشن والوں کو گراں قدر نقد انعامات سے نوازا گیا۔ تقریریں اردو اور عربی کے ساتھ انگریزی اور بنگلہ زبانوں میں بھی تھیں۔ یہ پروگرام زیر انتظام ناظم انجمن محترم جناب مولانا ابوطلحہ اعظمی صاحب استاذ حدیث جامعہ ہذا منعقد ہوا تھا اور حکمیت کے فرائض احقر فضیل احمد ناصری، محترم جناب مولانا مفتی محمد نوید قاسمی صاحب اور محترم جناب مولانا مفتی عبیدانور شاہ صاحب زیدمجدہم نے انجام دیئے۔

حضرت مولانا مفتی نثار خالد صاحب زیدمجدہم نے اپنے خطاب میں کہا کہ ماشاءاللہ جامعہ کی اس انجمن نے اپنی قدیم روایات کو باقی رکھا ہے اور بہتر نتائج دینے میں مؤثر کردار ادا کررہی ہے۔ انہوں نے طلبہ سے کہا کہ آپ اپنے اوقات کی سخت نگرانی کریں اور انہیں لایعنیات سے میلوں دور رکھیں، ان شاءاللہ اس کے نتائج آپ اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ اس موقع پر دیگر اساتذہ نے بھی اپنے مواعظ سے طلبہ کو مستفید کیا۔ حضرت مولانا صغیراحمد پرتاپ گڑھی صاحب زیدمجدہم کی پُرسوز دعا پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

رواقِ انظر کی پہلی منزل تکمیل کی دہلیز پر

جامعہ کا زیرِتعمیر دارالاقامہ پہلی منزل کی تکمیل کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ یہ دارالاقامہ تین منزلہ عمارت پر مشتمل ہوگا، جن میں سے پہلی منزل کا کام تکمیل کے قریب پہونچ چکا ہے۔ دیواریں اٹھنے کے بعد ان پر چھت پڑ چکی ہے۔ تعمیری مراحل الحمدللہ تیزی سے جاری ہیں۔ اس عمارت میں کل 46/ کمرے ہوں گے، جن کی تکمیل سے ان شاءاللہ تعالیٰ طلبہ کی رہائش کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہوجائے گا۔

مفتی نویداحمد دیوبندی کو صدمہ

جامعہ کے استاذِ حدیث وافتاء محترم جناب مفتی نویداحمد دیوبندی صاحب کے والدِ محترم حضرت مولانا سُرور احمد صدیقی جوارِرحمت میں چلے گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت

الفردوس میں مقام عطا کرے۔ عمر 68 کے آس پاس تھی۔

مرحوم دارالعلوم دیوبند کے قدیم ترین اساتذہ میں تھے۔ فارسی درجات کے کامیاب مدرس کے طور پر ان کی شناخت رہی ہے۔ ادھر چند برسوں سے بیمار رہنے لگے تھے۔ کافی دوا دارو ہوا، مگر جاں بر نہ ہو سکے۔

مرحوم فرض شناسی کی تصویر تھے۔ وفات والے دن بھی درس دیا تھا۔ درس دے کر 11 بجے گھر پہونچے اور آدھے گھنٹے کے اندر ہی آناً فاناً دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مولانا نے اپنی یادگار میں دو بیٹیاں اور ایک فرزند چھوڑا۔ فرزندِ ارجمند مفتی نوید احمد دیوبندی صاحب جامعہ میں استاذ ہیں۔ ان کی والدہ بھی چار ماہ قبل راہیٔ آخرت ہو چکی ہیں۔

مولانا کی وفات پر جامعہ میں ایصالِ ثواب کیا گیا۔ اساتذۂ جامعہ نے مرحوم کے اہلِ خانہ کو تعزیتِ مسنونہ پیش کی۔

مولانا غلام نبی کشمیری صاحب کا وصال

دارالعلوم وقف دیوبند کے سینئر استاذ حضرت مولانا غلام نبی کشمیری کے انتقال کی خبر جوں ہی موصول ہوئی، جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند نے سخت کرب محسوس کیا۔ اس موقعے پر ان کی مغفرت کے لیے دعا بھی کی گئی۔ رئیس الجامعہ حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری دامت برکاتہم نے کہا کہ مولانا کی وفات ہم سب کے لیے نہایت افسوسناک ہے، مگر وہی ہوا، جو کاتبِ تقدیر نے لکھا تھا۔ شاہ صاحب نے مزید فرمایا کہ مولانا غلام نبی کشمیری کے ساتھ ہمارے تعلقات تقریباً چار دہائیوں پر مشتمل ہیں۔ وہ میرے والدِ مرحوم فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ کے بے حد عقیدت مند رہے۔ ان سے بہت قریب بھی رہے۔ شاہ صاحب بھی ان پر بڑا اعتماد کرتے اور ان کی علمی قابلیت کو سراہتے۔ مولانا 1984 میں دارالعلوم وقف کے مدرس ہوئے اور تب سے ایامِ صحت تک پابندی سے پڑھاتے رہے۔ مرض الوفات میں رخصت لے لی تھی اور اب تو دنیا سے ہی رخصت ہو گئے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔

احقر نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولانا کشمیری کی وفات سے مجھے سخت صدمہ پہونچا ہے۔ اللہ ان کی قبر کو نور سے منور فرمائے۔

مولانا گوناگوں کمالات و امتیازات سے متصف تھے۔ تحریر، تقریر، تدریس ہر سہ میدانوں کے نہایت کامیاب شہ سوار تھے۔ کئی اچھی کتابیں بھی ان کے قلم سے نکلیں۔ عربی زبان پر بھی انہیں عبور حاصل

تھا۔ پونچھ سے نکلنے والے ماہنامہ ''فکر ونظر'' کے مدیر التحریر بھی تھے۔ دارالعلوم وقف کے آرگن ''ندائے دارالعلوم'' کے بھی برسوں تک مدیرِ تحریر رہے۔ بہت اچھا لکھتے تھے۔ جملوں کی تراش خراش، الفاظ کے انتخاب، خوب صورت ترکیبوں کی ایجاد میں انہیں کمالِ مہارت حاصل تھا۔

تقریر بھی بڑی دل چسپ کرتے۔ بعض اسفار میں ان کے ساتھ میری رفاقت رہی ہے۔ تقریروں میں بھی علم ومعلومات کے ہمراہ زبان وادب کی چاشنی رکھتے۔ حالاتِ حاضرہ کی نبض پر ان کی گہری نظر تھی۔ بڑے جچے تلے تبصرے کرتے۔

تدریس میں بھی انہیں درک میسر تھا۔ میں نے ان سے پڑھا تو نہیں ہے، مگر ان کے شاگردان انہیں بحر العلوم سے یاد کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے دروس کس شان کے متحمل ہوتے ہوں گے۔

بایں ہمہ کمالات مولانا انتہائی سادہ تھے۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت فرمائے۔

مفتی محمد سعید صاحب پالن پوری کے بھائی کی رحلت

جامعہ کے استاذِ حدیث محترم جناب مفتی محمد سعید صاحب پالن پوری زید مجدہم کو تازہ کرب جھیلنا پڑا۔ ان کے بڑے بھائی حافظ سعید پالن پوری طویل علالت کے بعد عالمِ باقی کی طرف چلے گئے۔

مرحوم محترم جناب مفتی محمد سعید صاحب کے بھائی اور دارالعلوم کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری مدظلہ کے دوسرے نمبر کے صاحب زادے تھے۔ وہ سورت کے کسی ادارے میں مدرس تھے۔ 50 برس کی عمر پائی۔ نمازِ جنازہ اور تدفین سورت میں ہی عمل میں آئی۔ اللہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ان کے وصال پر جامعہ میں دعائے مغفرت کی گئی اور پس ماندگان سے تعزیت بھی کی گئی۔

❁❁❁

Monthly MUHADDIS-E-ASR Deoband

Register from Registrar of Newspapers for India U.P. URD.2000/R.N.10663

Contact: (Off) 01336-220471, Mob. +91 8006075484

Email: ahmadanzarshah@gmail.com

Printed & Published by Syed Ahmad Khizar Shah,
Mohtamim of behalf of JIMAS, Behind Eidgah, DBD
and Printed at Mukhtar Press, Samreen Printers, Deoband



جامعہ کی مرکزی عمارت ''انور ہال'' اور مسجد انور شاہ پر مشتمل شاندار منظر



جامعہ میں زیر تعمیر جدید دارالاقامہ کا مجوزہ نقشہ



دارالاقامہ کا بیرونی منظر



مسجد انور شاہ

Jamia Imam Mohammad Anwar Shah

A/c No. 520101265117956

Corporation Bank Deoband, IFSC Code: CORP0000786